مسئلۂ ایصالِ ثواب

اور ایک ذہنی طغیان کا احتساب

مؤلف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

(م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

مسئلۂ ایصالِ ثواب

اور ایک ذہنی طغیان کا احتساب

مولف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ (م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
پن کوڈ:276403 موبائل:9235327576

تفصیلات

نام کتاب : مسئلہ ایصالِ ثواب اور ایک ذہنی طغیان کا احتساب
مؤلف : حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ
باہتمام : مولانا ضیاء الحق خیر آبادی
صفحات : 72
طبع اول : ۱۹۸۴ء
طبع دوم : اپریل ۲۰۱۵ء
کتابت : مولانا نوشاد احمد قاسمی معروفی
ناشر : مکتبہ ضیاء الکتب، خیر آباد، ضلع مئو (یوپی)
قیمت : 60/=

ای میل: **zeyaulhaquekbd@gmail.com**

ملنے کے پتے

☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
☆ مدرسہ سراج العلوم چھپرہ ضلع مئو یوپی 9235327576
☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926
☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دارارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

تمہید	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی	۹
پہلی بات	حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	۷
اعتذار	// // //	۱۰

☆☆☆☆☆

باب اول مسئلہ ایصال ثواب ۱۱

ایصال ثواب کن اعمال کا.. ۱۱

شرعی دلائل.. ۱۲

ایک غلطی.. ۱۲

ایصال ثواب کا ثبوت احادیث سے..................... ۱۳

حدیث نمبر (۱).. ۱۳

حدیث نمبر (۲).. ۱۵

حدیث نمبر (۳).. ۱۵

حدیث نمبر (۴).. ۱۶

امام ترمذی کا ارشاد.. ۱۷

حدیث نمبر (۵).. ۱۷

حدیث نمبر (۶).. ۱۸

حدیث نمبر (۷).. ۱۹

اجماع.. ۲۰

صاحب ہدایہ کی شہادت................................. ۲۰

علامہ ابن قدامہ اور علامہ مقدسی کی شہادت................ ۲۰

انتباہ ۲۱

باب دوم جائزہ ومحاسبہ ۲۳

مؤلف کی بیان کردہ مثال ۲۴

صحیح مثال ۲۵

دلائل ۲۵

مؤلف کا پہلا استدلال ۲۶

مؤلف کا دوسرا استدلال ۲۸

چند مثالیں ۲۹

مؤلف کے پہلے دعوی پر نظر ۳۲

مؤلف کے دوسرے دعوی پر نظر ۳۳

قول فیصل ۳۴

مؤلف کی عقل مندی کا ایک نمونہ ۳۶

دوسرا نمونہ ۳۶

تیسرا نمونہ ۳۸

ایک اصولی بات ۳۹

ترجمہ کی غلطی ۴۰

باب سوم مؤلف کے انتقادات ۴۲

حضرت علی والی روایت پر اعتراض ۴۲

کچھ اور اعتراض ۴۵

عجیب سمجھ ہے ۴۶

دو لطیفے ۴۷

علام شامی پر اعتراض ۴۷

قاضی قطر کا حوالہ ۴۹
مؤلف کا دوسری تنقیدی بیان ۵۰
مؤلف کا تیسرا تنقیدی پیراگراف ۵۱
مؤلف کی فہم اور بینائی ۵۴
بحث کا دوسرا رخ ۵۵
غیر متعلق بحثیں ۵۶
حضرت ام سعد کی نذر کیا تھی؟ ۵۷
نذر کی شرعی حیثیت ۵۸
کیا تکمیلِ نذر سے ثواب نہیں ہوتا؟ ۵۹
مصنف کی ذہانت کے دو اور نمونے ۶۰
باب چہارم طغیان ۶۲
نامعقول جسارت ۶۲
صحیح روایات کی تذلیل ۶۳
حضرت سعد بن عبادہ کی تحقیر ۶۴
ائمہ حدیث کی شان میں گستاخیاں ۶۴
کچھ اور ہرزہ سرائیاں ۶۵
اصل صورت واقعہ ۶۷
دریدہ ذہنی کی حد ۶۸
آخری بات ۶۹

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

آج سے تقریباً تیس سال پہلے مبار کپور کے ایک صاحب نے ’’ردایصالِ ثواب‘‘ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں انھوں نے بڑے شدومد کے ساتھ ایصال ثواب کا انکار کیا، اور صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ائمۂ محدثین اور علماء وفقہاء کا بڑے گستاخانہ وتمسخرانہ انداز میں ذکر کیا، مبلغ علم کا حال یہ تھا کہ چند ناول اور کچھ اردو کی کتابیں ان کا کل سرمایۂ علم تھا جس کی وجہ سے قرآن وحدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں انھوں نے جگہ جگہ ٹھوکر کھائی، اس کتاب سے لوگوں میں تشویش پیدا ہوئی اور ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا علمی جائزہ لیا جائے اور اس سلسلے میں قرآن و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں جو درست معلومات ہیں اسے پیش کیا جائے، تاکہ لوگوں کی تشویش اور اضطراب دور ہو۔

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ نے اس صورت حال کی سنگینی کو محسوس کر کے قلم اٹھایا اور اس کا مکمل علمی احتساب کر کے مولف کی کجروی کو اجاگر کیا اور مسئلے کی صحیح صورت حال کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا، یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مسئلہ ایصال ثواب کو احادیث کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اصل کتاب کا جائزہ اور اس پر محاسبہ ہے۔ تیسرے باب میں مولف کے انتقادات کا رد کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں بطور نمونہ مولف کے کچھ ہفوات اور ہرزہ سرائیوں کا ذکر ہے جو انھوں نے ائمہ کرام کی شان میں کی ہیں۔ پھر آخری بات کے عنوان سے اس بات کو بیان کیا ہے کہ اس طرح کی کتابیں کیونکر اور کس جذبے کے تحت وجود میں آتی ہیں، اور اس سلسلے میں واقعی صورت حال کیا ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے ختم تھی، افادۂ عام کیلئے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

ضیاء الحق خیر آبادی

۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۱/ مارچ ۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پھلی بات

تین چار ماہ قبل ایک استفتا مبارکپور سے موصول ہوا تھا، مضمون یہ تھا کہ ’’بکر‘‘ ایصال ثواب کا منکر ہے اور اس پر فلاں فلاں دلیل پیش کرتا ہے۔ مبارکپور میں حنفی و اہل حدیث آویزش چلتی رہتی ہے، ذہن اس طرف گیا کہ کسی اہل حدیث نے چھیڑ خانی کی ہوگی، یہی بات ذہن میں رکھ کر قدرے مفصل فتویٰ لکھ دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمہ کی وفات ہوئی اور شرکت جنازہ کی غرض سے مبارکپور جانا ہوا، تو احباب نے بتایا کہ یہ مسئلہ عرصہ سے موضوع بحث بنا ہوا ہے اور کوئی عبدالخالق صاحب ہیں جنھوں نے اس کے انکار کا علَم بلند کر رکھا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ متعدد جگہوں سے فتاویٰ جمع کر کے موصوف تنقید لکھ رہے ہیں، پھر بات ذہن سے نکل گئی۔ چار پانچ روز قبل جناب مولانا عبدالرب صاحب اعظمی استاذ مدرسہ دینیہ غازی پور، کسی ضرورت سے مبارکپور تشریف لے گئے تھے، واپسی میں ایک کتاب ’’ردِّ ایصالِ ثواب‘‘ لا کر دی، ہم نے کھولا کہ شاید ہمارے جواب پر بھی تنقید کی ہوگی؛ لیکن معلوم ہوا کہ ہدفِ تنقید مفصل طور پر مفتی جمیل احمد صاحب نذیری استاذ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور ہیں اور دو تین جگہوں کے فتووں پر۔ جن میں مدرسہ دینیہ کا بھی فتویٰ شامل ہے۔ صرف اتنا تبصرہ فرمایا ہے کہ:

> ان جوابات میں، مَیں نے وہی تتبع پایا، جو بریلوی حضرات دیوبندی علماء کو دیتے آئے ہیں۔ (ص:۳۸)

یہ کتابچہ ۱۶۰؍ صفحات پر مشتمل ہے، پوری کتاب پڑھ کر طبیعت نہایت بدمزہ ہوئی اور اذیت بھی بہت ہوئی، پوری کتاب لغویات سے پُر ہے، خواہ مخواہ کی ادّعاء، ہمہ دانی، علماء امت پر بے تحاشا یورش و یلغار، جو جی میں آئے کہے چلے جانا، کسی بات کو سمجھے بغیر اس پر تبصرہ

شروع کر دینا، طنز و استہزاء، مسخرہ پن، غیر سنجیدگی، احادیث صحیحہ کا انکار، آیات قرآنی کا بے محل استعمال، انفرادیت کا شوق یہی اس کتاب کی سوغاتیں ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کتاب نے عوام الناس میں تشویش کی لہر دوڑا دی ہے، لوگ استفہامیہ نگاہوں سے علماء کی طرف دیکھ رہے ہیں، بعض لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ پہلے ارادہ ہوا کہ اس کتاب پر مختصر تبصرہ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیں؛ مگر بعد میں مناسب معلوم ہوا کہ اس کا مکمل جائزہ ہی لے لیا جائے، اور ساتھ ہی ساتھ ایصال ثواب پر تشفی بخش مضمون بھی لکھ دیا جائے۔ چنانچہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کتاب میں مؤلف کی علمی حالت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے، اب اس پر مزید لکھنے کی حاجت نہیں ہے؛ البتہ ان کی خدمت میں مولانا ابوالحسن علی ندوی - گو کہ مؤلف ان سے بدگمان ہیں - کی ایک بات ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں:

> ”بعض فضلاء اپنے نظریات وتحقیقات کے اظہار میں بہت عجلت سے کام لیتے ہیں، ان کی اشاعت ہو جاتی ہے، پھر وہ کچھ عرصہ کے بعد، خود ہی ان سے رجوع کر لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا اخلاقی فرض انجام دیتے ہیں؛ لیکن جو لوگ اس عرصہ میں ان نظریات وتحقیقات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، ان کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب اس کا تعلق ایمانیات اور عقائد سے ہو۔ اس لیے ہمیں اپنی تحقیقات کی اشاعت وتبلیغ کے بارے میں، خاص طور پر جب کہ ان کا تعلق عقائد ودینیات سے ہو، عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لینا چاہئے، ان پر بار بار غور کرنا چاہئے، ان کو شک وشبہہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے، ماہرین فن کے سامنے پیش کرنا چاہئے اور ان کی رائے اور مشورہ کا انتظار کرنا چاہئے، پھر اس کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دینی چاہئے۔ یہ دورِ انتشار ہے، اس وقت طبیعتیں انتشار انگیزی کے لیے ہر وقت آمادہ ہیں، انسان ہمیشہ سے سہولت پسند اور حیلہ جو، واقع ہوا ہے، جدید تمدن نے، سائنسی ترقی کی رفتار نے اور معیارِ زندگی کی بلندی نے اس کو زیادہ سہولت پسند اور انتشار پسند بنا دیا ہے؛ اس لیے ہم ایسی بات کہنے سے احتراز کریں، جس سے لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔“
>
> (اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں۔ ص:۳۶)

مولانا ندوی کا یہ مشورہ بہت ضروری اور مفید ہے۔ مؤلف موصوف نے اس کتاب میں اپنی چند اور کتابوں کا ذکر کیا ہے، ان کے ناموں سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بھی یہی سوغاتیں ہوں گی۔ مؤلف سے ہماری گزارش ہے کہ امت میں خواہ مخواہ انتشار برپا نہ کریں، یوں ہی مسلمان ہر وقت لڑتا مرتا رہتا ہے، انتشار کی آگ میں آپ مزید ایندھن نہ ڈالیں، آپ کا جو کام ہے: کپڑا بُننا، بیچنا اور بچوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا، اور جو کچھ موقع ملے اس میں مطالعہ کرنا، وہ کرتے رہئے۔ اہل حق کے طریقے سے خروج نہ کیجئے، ورنہ آخرت کے خسارے میں پڑ جایئے گا۔ علم کی باریکیوں کو علماء کے لیے چھوڑ دیجئے، ہر شخص اس بحر بیکراں میں شناوری کے لائق نہیں ہے، جو کوئی اناڑی پن سے کودے گا غرق ہو جائے گا۔ اور اگر موصوف کو اپنی تحقیقات پر اصرار ہو تو یہ سمجھ کر انھیں بازار میں بھیجیں کہ کچھ لوگ جواہر اور خزف ریزوں کو پرکھنا بھی جانتے ہیں۔

عام مسلمانوں سے ہماری درخواست ہے کہ کتابیں صرف معتبر علماء کی پڑھیں، ہر کسی کی کتاب پڑھنے لگیں گے تو سوائے انتشار و پراگندگی اور عقیدۂ و عمل کی تباہی کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ دین و دیانت اور عقیدہ و عمل ایسی معمولی اور بے قیمت چیزیں نہیں ہیں کہ ہر دو حرف جاننے والے کے ہاتھ میں اسے تھما دیا جائے۔ یہ دور بڑے فتنوں کا دور ہے، ہر طرف ایمان و عمل کے خریدار پھرتے رہتے ہیں، جو سستے داموں آپ کا سرمایہ خرید کر اسے ضائع کرنا چاہتے ہیں، اور آپ کو مفلس و قلاش بنا دینا چاہتے ہیں۔ عقیدہ و عمل کی جو ڈگر معتبر و مستند علماء سے عصر بعصر منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے، جو قرآن و سنت کی واضح دلیلوں سے ماخوذ و مستنبط ہے، اس پر استقامت اختیار کیجئے۔ آپ حضرات کو دوسری مصروفیات کی وجہ سے علمی و دینی مسائل کی مکمل تحقیقات کی فرصت نہیں ہے؛ اس لیے معتبر علماء پر اعتماد کرنا ضروری ہے، ہر کسی کی بات کان نہ دھریئے۔ اللہ ہم سب کو سیدھی راہ پر قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

اعجاز احمد اعظمی
۲۷؍ ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ

اعتذار

ہمارا ارادہ تھا کہ نہایت نرم گفتاری کے ساتھ کتاب پر تبصرہ کریں گے، لیکن ہمیں اعتراف ہے کہ ہم اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مؤلف کے بیجا تند و تیز حملوں نے اکثر جگہوں پر ہماری قوت برداشت کو چیلنج کیا، کہیں ہمارا ارادہ غالب رہا اور کہیں ان کا چیلنج۔ مؤلف پڑھیں گے تو انھیں تکلیف ہوگی؛ لیکن ہم معذور ہیں، کیوں کہ موصوف نے بڑا جارحانہ حملہ کیا ہے۔ علمی مضامین میں سنجیدگی کا دامن تھامے رہنا بہت ضروری ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☐ باب اول

مسئلہ ایصال ثواب

ایصال ثواب کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور قرآن وحدیث کی بشارت کے مطابق اللہ کی طرف سے اجر وثواب کا مستحق ہوتا ہے، اب وہ شخص دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! اس کارِ خیر پر مجھے جو ثواب آپ کی جانب سے مرحمت ہوا ہے، اسے فلاں مسلمان کو عطا فرما دیجئے۔ یا وہ کارِ خیر ابتداء ہی سے اسی نیت سے کرے کہ اس کا ثواب فلاں شخص کو عطا ہو جائے۔ خلاصہ اس مسئلے کا یہ ہے کہ ایک کے کارِ خیر کا ثواب دوسرے کو مل سکتا ہے۔ ایصال ثواب میں خداوند تعالیٰ سے اسی کی درخواست ہوتی ہے، اس میں زندہ یا مردہ پر مسئلہ موقوف نہیں ہے، خواہ زندہ کو ثواب بخشا جائے یا مردہ کو، ہر ایک کی بناء ایک ہے کہ ایک کا ثواب دوسرے کو دیا جا سکتا ہے۔ اور جس طرح بندہ کسی کے حق میں دعائے مغفرت کر کے یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہے کہ میری دعا قبول ہو گئی ہوگی، اور جس کے حق میں دعا کی گئی ہے، حق تعالیٰ اسے یقیناً بخش دیں گے؛ کیوں کہ خداوند کریم نے دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایصال ثواب کی دعا کر کے بھی بندہ یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہے کہ حق تعالیٰ اسے ثواب بخش دیں گے۔ یہ ایک شرعی مسئلہ ہے؛ البتہ ایصال ثواب کے جو طریقے من گھڑت عوام الناس نے ایجاد کر رکھے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

ایصال ثواب کن اعمال کا؟ ہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کن اعمال کا ثواب کسی کو بخشا جا سکتا ہے؟ تو اس سلسلے میں ائمہ کے درمیان کچھ تھوڑا سا اختلاف ہے: بعض حضرات کے نزدیک محض مالی عبادت کا ثواب بخشا جا سکتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک

مالی اور بدنی دونوں عبادات کا۔ لیکن یہ موضوع ہماری گفتگو سے خارج ہے۔ ہمیں صرف نفس ایصال ثواب پر گفتگو کرنی ہے؛ کیوں کہ چیلنج صرف اسی اتنے حصے کو کیا گیا ہے۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اپنے ایمان کا ثواب کسی غیر کو نہیں بخشا جا سکتا۔

شرعی دلائل: کوئی شرعی مسئلہ خواہ واجب ہو یا سنت، مستحب ہو یا مباح، مکروہ یا ناجائز، کسی کو حق نہیں کہ محض اپنی رائے اور قیاس سے اس کا دعویٰ کرے، شریعت اللہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ اللہ کے ترجمان ہیں۔ حضرات صحابہ کرام ؓ اور محدثین وفقہاء رسول اللہ ﷺ کے اقوال واعمال، ارشادات وفرمودات کے ناقل ومحافظ ہیں، اب لازم ہے کہ کوئی شخص جب کسی شرعی بات کا دعویٰ کرے تو قرآن سے ثبوت پیش کرے، یا احادیث رسول سے استدلال کرے۔ اور احادیث کے لیے اسے محدثین کی جانب رجوع کرنا ہوگا، اگر کسی بات کا مطلب سمجھنے میں دشواری ہو تو صحابہ کرام، محدثین اور فقہاء کے بتائے ہوئے مطلب پر اعتماد کرنا ہوگا۔ پھر قرآن سے جو مسئلہ ثابت ہوگا وہ تو بالکل قطعی ہوگا، جو مسائل حدیث سے ثابت ہوں گے ان کا درجہ اس کے بعد ہوگا، پھر اگر قرآن وحدیث سے ثابت شدہ مسئلہ پر تمام علماء کا اتفاق ہو جائے تو اسے اجماع کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”میری امت کسی گمراہی اور غلط مسئلے پر متفق نہیں ہو سکتی۔“ اس کی بناء پر یہ بات قطعی ہے کہ اجماع امت بھی دلائل شرعیہ میں ہے۔ ان تینوں کے بعد قیاس صحیح جو ان تینوں دلائل سے ماخوذ ہو، وہ بھی دلیل شرعی ہے۔ اس وضاحت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ جو مسئلہ ان چاروں دلائل میں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہو وہ شرعی مسئلہ ہے۔

ایک غلطی: بعض لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ فلاں مسئلہ قرآن سے ثابت کرو۔ یہ ایک خطرناک غلطی ہے، اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کہنے والا حدیث رسول، اجماع امت اور قیاس صحیح کو دلیل شرعی نہیں سمجھتا۔ اگر اس کی یہ بات تسلیم کر لی جائے تو دین کے ایک بڑے حصے سے؛ بلکہ پورے دین ہی سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ کیوں کہ قرآن سے مثلاً نماز کی فرضیت کا ثبوت ملتا ہے، مگر یہ کہ وہ پانچ وقت کی ہے، اس کی اتنی رکعتیں ہیں، ان

سب کا ثبوت احادیث اور اجماع سے ہے۔ اس لیے قرآن جہاں دلیل شرعی ہے وہیں دوسرے دلائل بھی برحق ہیں۔ اگر کسی مسئلے کے ثبوت میں کوئی صحیح دلیل پیش کر دی جائے، بس کافی ہے۔ اس غلطی کی مثال یوں سمجھئے کہ آپ نے عدالت میں کوئی مقدمہ دائر کیا، اور ثبوت میں دو گواہ پیش کئے، اگر مدعیٰ علیہ اس پر یہ مطالبہ شروع کر دے کہ ان گواہوں پر مقدمہ کی عمارت نہ کھڑی ہوگی۔ میں دعویٰ اس وقت تسلیم کروں گا جب کہ وزیر اعظم آ کر گواہی دیں۔ سوچئے اس مطالبے کو کون حق بجانب کہہ سکتا ہے! ٹھیک یہی حال ہر مسئلے میں قرآن سے دلیل کا مطالبہ کرنے والوں کا بھی ہے۔

ایصال ثواب کا ثبوت احادیث سے: ایصال ثواب کی بنیادی علت جس کا ذکر اجمالاً اوپر آ چکا ہے کہ ایک کی نیکی سے دوسرا شخص بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس کے ثواب میں دوسرے کا بھی بھلا ہو سکتا ہے۔ یہ بنیادی علت خود قرآن میں بھی مذکور ہے۔ تاہم ایصال ثواب کی متعارف صورت قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اس لیے اس جگہ ہم آیت قرآنی کو زیر بحث نہیں لائیں گے، اس پر مکمل گفتگو کتاب کے دوسرے باب میں آئے گی۔ ان شاء اللہ وہاں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ایصال ثواب کی بنیادی علت کا ثبوت قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس اجمالی بات کو یہاں ذہن میں محفوظ رکھ لیجئے؛ تاکہ ذہن میں یہ وسوسہ نہ ابھرے کہ جو حدیثیں ایصال ثواب کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہیں وہ قرآن سے ٹکرا رہی ہیں اور ان کے ماننے سے قرآنی آیات کا انکار لازم آئے گا، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مؤلف کتاب کے فہم کی کوتاہی ہے کہ اس صاف ستھرے مسئلہ کو آیات قرآنی کے خلاف سمجھ بیٹھے ہیں۔ اب حدیثیں دیکھتے چلئے:

حدیث نمبر (١): ترمذی شریف کتاب المناسک کھولئے، امام ترمذیؒ ایک عنوان قائم کرتے ہیں:

> بَابُ مَا جَاءَ فِي الْحَجِّ عَنِ الشَّيْخِ الْكَبِيرِ وَالْمَيِّتِ. بوڑھے اور میت کی جانب سے حج کے سلسلے میں احادیث۔

صحاح (صحیح احادیث کے مجموعے) کی جس کتاب کو جی چاہے اٹھا لیجئے، یہ باب آپ کو مل جائے گا۔ اس کے ذیل میں امام ترمذی کئی حدیثیں نقل فرماتے ہیں، ان حدیثوں کا تعلق زندوں سے بھی ہے اور مُردوں سے بھی، زندوں کے سلسلے میں ایک خثعمی عورت کا قصہ تو صحاح کی تقریباً سبھی کتابوں میں منقول ہے۔ ہم یہاں وہ حدیث نقل کرتے ہیں جس کا تعلق میت سے ہے۔ لکھتے ہیں:

> **عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: جَاءَ تْ اِمْرَأَةٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: اِنَّ أُمِّيْ مَاتَتْ وَلَمْ تَحُجَّ أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ: حُجِّيْ عَنْهَا. قَالَ اَبُوْعِيْسىٰ: هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ.**
>
> حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس نے عرض کیا کہ میری ماں فوت ہوگئیں اور حج نہ کرسکیں، کیا میں ان کی جانب سے حج کرسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، ان کی جانب سے حج کرلو۔ (یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

ایصال ثواب کی جو حقیقت ہم نے عرض کی ہے، اس کو پیش نظر رکھئے اور اس حدیث پر غور کیجئے، ایک عورت جس کی ماں حج نہیں کرسکی، خواہ اس پر حج فرض تھا یا اس نے نذر مان رکھی تھی، بہر صورت حج کارِ ثواب ہے۔ اب عورت چاہتی ہے کہ ارکانِ حج میں ادا کروں اور اس کے ثواب سے ماں مستفید ہو، رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ایصال ثواب کا ثبوت مہیا ہوگیا۔ اس میں یہ موشگافی کرنا کہ کیا عورت کے اس عمل کی وجہ سے اس کی ماں حاجی ہوجائے گی، بالکل لغو سوال ہے۔ اس کا کون دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی ماں کو حاجی کہا جائے؟ بات صرف اتنی ہے کہ مُردہ کو اس کے ثواب سے استفادہ ممکن ہے۔ جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ مُردہ کسی دوسرے کے عمل سے استفادہ کر ہی نہیں سکتا، انھیں چاہئے کہ کوئی صحیح اور واضح دلیل پیش کریں۔

ہاں، اگر کوئی شخص یہ مطالبہ کرے کہ حدیث میں ایصال ثواب کا لفظ دکھاؤ؟ تو ہم معذور ہیں؛ لیکن ایسا شخص سوچ لے کہ وہ عقل وخرد کے کس بلند مقام پر کھڑا ہے؟

حدیث نمبر (۲): بخاری شریف کتاب الصوم کھولئے، امام بخاریؒ: بَابُ مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَوْمٌ. کسی کے ذمہ روزہ ہے اور وہ مر گیا۔ کے تحت ایک حدیث نقل کرتے ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ مَّاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم کا ارشاد نقل کرتی ہیں کہ جس کے ذمہ روزہ باقی رہ گیا ہو، اس کی جانب سے اس کا ولی روزہ رکھ لے۔

حدیث (۳): اسی باب میں امام بخاریؒ ایک اور حدیث نقل کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ أُمِّيْ مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صَوْمُ شَهْرٍ أَفَأَقْضِيْهِ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ: فَدَيْنُ اللّٰهِ أَحَقُّ أَن يُّقْضٰى.

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کیا کہ میری ماں کا انتقال اس حال میں ہوا ہے کہ اس کے ذمہ ایک مہینے کا روزہ باقی رہ گیا ہے، کیا اس کی طرف سے میں قضا کر ڈالوں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، اللہ کا دَین ادائیگی کا بدرجۂ اولیٰ استحقاق رکھتا ہے۔

اچھی طرح غور فرمالیجئے، یہ دونوں حدیثیں بخاری شریف سے لی گئی ہیں، جو باجماعِ امت کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب ہے، اس کی روایت پر شک وشبہ کی نگاہ نہ ڈالئے، ورنہ بات خطرناک حدود تک پہنچ سکتی ہے۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ایصال ثواب کی تفصیلات کو بیان کرنا، اور اس میں راجح مسلک کو تحریر کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے؛ اس لیے روزے کی قضا کے مسائل سے قطع نظر، اصولی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایک کے عمل کا ثواب دوسرے کو پہنچتا ہے۔ ورنہ روزہ رکھے بیٹا، اور ذمہ اترے ماں کا، اس کا کیا مطلب ہوا؟ آخر ثواب نہیں پہنچا تو کیا ہوا؟ چلئے مان لیا کہ بیٹا نائب بن کر اس کی جانب سے روزہ رکھ رہا ہے، جب بھی نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دیکھنا صرف اتنا ہے کہ ایک کا

عمل دوسرے کے حق میں جارہا ہے یا نہیں؟ یقیناً جارہا ہے۔ پھر ایصال ثواب میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ تاہم یہ بھی یاد رکھئے کہ نیابت اس وقت ہوسکتی ہے، جب مرنے والے نے اس کی وصیت کی ہو، اور اپنا نائب بنایا ہو۔ ان دونوں حدیثوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں، پس مسئلہ محض تبرع کا ہے۔

اسی ترجمۃ الباب میں امام بخاریؒ سید التابعین حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

اِنْ صَامَ عَنْهُ ثَلَاثُوْنَ رَجُلاً يَوْماً وَّاحِداً جَازَ. اگر میت کے ذمہ ۳۰؍روزے ہوں اور ایک ہی دن ۳۰؍آدمی اس کی جانب سے روزہ رکھ لیں تو جائز ہے۔

حضرت حسن بصریؒ کے اس ارشاد میں نیابت کا کوئی ذکر نہیں۔ اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ کسی کی طرف سے روزہ رکھ لیا، بس نیابت ہوگئی، تو گو کہ اس طرح نیابت نہیں ہوتی؛ لیکن غور کیجئے کہ اصل مسئلے میں اس سے کیا فرق پڑ گیا؟ ایک کا عمل دوسرے کے نامۂ اعمال میں بہرحال درج ہورہا ہے۔

حدیث (۴): ترمذی شریف پھر کھولئے، ابواب الزکوۃ میں ایک باب آپ کو ملے گا، **بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّدَقَةِ عَنِ الْمَيِّتِ.** میت کی جانب سے صدقہ کے بارے میں احادیث۔ اس باب کے تحت امام ترمذیؒ اپنی سند سے ایک حدیث تحریر فرماتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنَّ أُمِّيْ تُوُفِّيَتْ أَفَيَنْفَعُهَا اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: اِنَّ لِيْ مَخْرَفاً فَأُشْهِدُكَ أَنِّيْ قَدْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا. قَالَ أَبُوْعِيْسَىٰ: هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میری ماں وفات پاچکی ہیں، اگر میں ان کی جانب سے کچھ صدقہ کروں تو کیا انھیں اس سے کچھ نفع ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، اس نے عرض کیا: میرے پاس ایک باغ ہے، میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ اسے ماں کی جانب سے

صدقہ کرتا ہوں۔

یہ حدیث بھی ایصال ثواب کے مسئلہ میں بہت واضح اور روشن ہے۔ یہ پوچھنے والا کوئی بھی ہو، اور کسی بھی نوعیت کا سوال ہو، اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک کا عمل ہو اور دوسرا اس کے عمل سے مستفید ہو، یہی ایصال ثواب کی بنیاد ہے۔ اور یہ بنیاد ناظرین غور کرلیں، یہاں پائی جاتی ہے یا نہیں؟

امام ترمذیؒ کا ارشاد: آگے چلئے، امام ترمذیؒ اس حدیث کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

> وَبِہٖ یَقُوْلُ أَھْلُ الْعِلْمِ، یَقُوْلُوْنَ: لَیْسَ شَیْئٌ یَصِلُ اِلَی الْمَیِّتِ اِلَّا الصَّدَقَۃُ وَالدُّعَاءُ. اہل علم اسی کے قائل ہیں، فرماتے ہیں کہ میت کو بجز صدقہ اور دعا کے کوئی چیز نہیں پہنچتی ہے۔

دیکھ رہے ہیں! امام ترمذیؒ جو علم حدیث کے امام ہیں، ان کو یہاں نیابت اور نذر کے مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں ہوئی، سیدھا سادہ مطلب ایصال ثواب والا بیان کردیا۔

حدیث (۵): حدیث کی مشہور کتاب ابن ماجہ ابواب الاضاحی کھولئے، امام ابن ماجہ حدیث نقل کرتے ہیں:

> عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ: ضَحّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَوْمَ عِیْدٍ بِکَبْشَیْنِ. فَقَالَ حِیْنَ وَجَّھَھُمَا: اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفاً وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ. اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّأُمَّتِہٖ.
>
> حضرت جابر بن عبداللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عید کے موقع پر دو مینڈھوں کی قربانی فرمائی۔ جانور کو قبلہ رُو لٹانے کے بعد، آپ نے یہ

آیات پڑھیں: اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ **پھر فرمایا:** اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ محمد کی جانب سے اور امت محمد کی جانب سے۔

حدیث (٦): ابن ماجہ ہی کی دوسری حدیث اسی باب میں نقل فرماتے ہیں:

عَنْ عَائِشَۃَ وَأَبِیْ ھُرَیْرَۃَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَانَ اِذَا أَرَادَ أَنْ یُّضَحِّیَ اِشْتَرٰی کَبْشَیْنِ عَظِیْمَیْنِ سَمِیْنَیْنِ أَقْرَنَیْنِ أَمْلَحَیْنِ مَوْجُوْئَیْنِ، فَذَبَحَ أَحَدَھُمَا عَنْ أُمَّتِہٖ لِمَنْ شَھِدَ لِلّٰہِ بِالتَّوْحِیْدِ وَشَھِدَ لَہٗ بِالْبَلَاغِ، وَذَبَحَ الْآخَرَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّعَنْ آلِ مُحَمَّدٍ ﷺ۔

حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ دونوں حضرات راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قربانی کا ارادہ فرماتے تو دو بڑے، موٹے، سینگوں والے، چتکبرے، خصی مینڈھے خرید فرماتے۔ ایک کو اپنی امت کی جانب سے، جنھوں نے توحید کا اقرار کیا اور نبی ﷺ کی رسالت کی شہادت دی ہو، ذبح فرماتے۔ اور دوسرا اپنی طرف سے اور اپنی آل کی طرف سے۔

ناظرین کرام! نبی کریم ﷺ نے دو مینڈھے قربان کئے، ثواب کس کو حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ آپ کو حاصل ہوا۔ پھر آپ نے ایک مینڈھے کو امت کے حق میں نامزد فرمایا۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ کیا آپ کا مقصود یہ تھا کہ وحدانیت و رسالت کا اقرار کرنے والی امت اس کے گوشت کی مستحق ہوگی؟ کھلی بات ہے کہ تھوڑی سمجھ رکھنے والا آدمی بھی اس مطلب کا تصور نہیں کرسکتا، چلئے یہ مطلب نہیں ہوسکتا۔ تو کیا یہ مطلب ہے کہ آپ کی اس قربانی کے باعث امت کی گردن سے اس کا وجوب اس سال ساقط ہوگیا؟ ظاہر ہے کہ یہ بھی بات نہیں ہوسکتی، پھر بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ امت اس کے اجر و ثواب کی مستحق ہو، اگر یہ بھی مطلب نہیں ہے، تو پھر آخر کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ انھیں حدیثوں کی روشنی میں پوری امت ایصال ثواب کے برحق ہونے پر متفق ہے۔

حدیث (۷): ترمذی پھر کھولئے، ابواب الاضاحی نکالئے، اس کے تحت امام ترمذیؒ حدیث لاتے ہیں:

> عَنْ عَلِيٍّ أَنَّهُ كَانَ يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ أَحَدُهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَالْآخَرُ عَنْ نَفْسِهٖ. فَقِيْلَ لَهٗ: فَقَالَ: أَمَرَنِيْ بِهٖ يَعْنِيْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَا أَدَعُهٗ أَبَداً.

> حضرت علی رضی اللہ عنہ دو مینڈھوں کی قربانی کیا کرتے تھے: ایک نبی ﷺ کی جانب سے اور دوسرا اپنی طرف سے۔ اس سلسلے میں آپ سے سوال کیا گیا، آپ نے فرمایا کہ مجھے نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے، میں اس عمل کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ حدیث رسول مقبول ﷺ کی جانب سے قربانی کرنے کے باب میں بالکل صریح ہے، اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے، باقی مفصل کلام اس حدیث کے متعلق کتاب کے دوسرے حصے میں آئے گا۔

یہ سات حدیثیں ہم نے ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔ مسئلہ کے اثبات کے لیے ایک صحیح حدیث بھی کافی ہے؛ کیوں کہ جس بات کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے ایک بار بھی مل گیا اور کوئی دوسری حدیث یا آیت سے اس کا منسوخ ہونا معلوم نہ ہوا، اور وہ شرعی مسئلہ ہے، اس کو محض اپنی عقل کی نارسائی یا محدثین سے بدگمانی کے باعث رد کرنا سخت ناعاقبت اندیشی کی بات ہے۔ محدثین نے آخری حد تک کاوش و محنت کر کے پورے خلوص وللّٰہیت اور صحیح فہم و فراست کی روشنی میں جن حدیثوں کو صحیح قرار دیا اور فقہاء نے تفقہ واجتہاد کی انتہائی بلندیوں سے ان کا مطلب و مقصد متعین کیا، انھیں صرف اس بنیاد پر رد کر دینا کہ ہماری مختصر اور چڑیے جیسی عقل میں نہیں آتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ عقل وشعور کی بات ہے؟ خوب یاد رکھئے کہ محدثین کا اعتماد برہم کر کے دین میں ایک قدم بھی آپ نہیں چل سکتے۔ ان ائمہ نے جو چراغ روشن کئے ہیں، اعتماد کھو دیجئے گا تو سب یکا یک گُل ہو جائیں گے، پھر آپ ایسی تاریکی میں ڈوب کر رہ جائیے گا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دے گا۔ تفصیلات دوسرے حصے میں پڑھئے۔

اجماع: احادیث کی روشنی میں آپ نے ایصال ثواب کا ثبوت پڑھ لیا، اب ذرا اجماع بھی دیکھتے چلئے، ابھی آپ نے امام ترمذیؒ کا ارشاد چند صفحہ قبل پڑھا ہے، اسے پھر دہرا لیجئے:

وَبِہٖ یَقُوْلُ أَھْلُ الْعِلْمِ، یَقُوْلُوْنَ: لَیْسَ شَیْئٌ یَصِلُ اِلَی الْمَیِّتِ اِلَّا الصَّدَقَۃُ وَالدُّعَاءُ. اہل علم اسی کے قائل ہیں، فرماتے ہیں کہ میت کو بجز صدقہ اور دعا کے کوئی چیز نہیں پہنچتی۔

ہم نے پہلے عرض کر دیا ہے کہ ایصال ثواب کی تفصیلات میں جانا ہمارا موضوع نہیں۔ اس عبارت کا مدعا صرف اتنا ہے کہ اہل علم ایصال ثواب کی مشروعیت پر متفق ہیں۔

صاحبِ ہدایہ کی شہادت: فقہ حنفی کی مشہور درسی کتاب ''ہدایہ'' کی ایک عبارت پڑھتے چلئے:

اَلْاَصْلُ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ أَنَّ الْاِنْسَانَ لَہٗ أَنْ یَّجْعَلَ ثَوَابَ عَمَلِہٖ لِغَیْرِہٖ صَلٰوۃً أَوْ صَوْماً أَوْ صَدَقَۃً أَوْ غَیْرَھَا عِنْدَ أَھْلِ السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ. اس باب میں اصل یہ ہے کہ انسان کے لیے جائز ہے کہ اپنے عمل کا ثواب دوسرے کو بخش دے، خواہ وہ عمل نماز ہو، روزہ ہو، صدقہ ہو یا کچھ اور۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک مسئلہ یہی ہے۔

لیجئے، بات صاف ہوگئی۔ تمام اہل سنت ایصال ثواب کے حق ہونے پر متفق ہیں۔ اگر کسی کو ان سے علاحدہ چلنے کا شوق ہو تو جائے؛ لیکن اپنے کو اہل سنت کہنا ترک کر دے۔

علامہ ابن قدامہ اور علامہ بہاء الدین مقدسی حنبلی کی شہادت:

فقہ حنبلی کی مشہور کتاب ''العمدۃ'' میں علامہ ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں:

وَأَیُّ قُرْبَۃٍ فَعَلَھَا وَجَعَلَ ثَوَابَھَا لِلْمَیِّتِ الْمُسْلِمِ نَفَعَہٗ ذٰلِکَ. جو بھی کارِ خیر کرے اور اس کا ثواب مسلمان میت کو بخش دے، تو اس کا نفع اس کو حاصل ہوگا۔

اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے علامہ بہاء الدین مقدسی حنبلی تحریر فرماتے ہیں:

وَأَمَّا قِرَاءَةُ الْقُرْآنِ وَاِهْدَاءُ ثَوَابِهٖ لِلْمَيِّتِ فَالْاِجْمَاعُ وَاقِعٌ عَلٰى فِعْلِهٖ مِنْ غَيْرِ نَكِيْرٍ. رہی قرآن کی تلاوت اور اس کا ثواب مُردے کو بخشنا، تو اس عمل پر اجماع ہے۔ اور اس کا انکار کوئی نہیں کرتا۔

غرض تمام اہل سنت، چاروں ائمہ اس مسئلہ پر متفق ہیں۔ اس کے بعد اگر زید، عمرو، بکر اختلاف کریں تو اس کا کیا وزن ہوسکتا ہے؟ تمام مسلمان بھائیوں سے نہایت دلسوزی کے ساتھ عرض ہے کہ جن مسائل پر تمام ائمۂ اہل حق متفق ہوں، ان کے متعلق کسی ایرے غیرے کی کسی تحریر و تقریر سے متأثر نہ ہوں۔ گمراہ کرنے والے تو ہر دور میں ہاہو مچاتے ہی رہتے ہیں، اگر ان کی آوازوں پر کان دھرا جائے، تو اپنے مذہب ہی کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ خود سوچ لیں کہ ان ائمہ و محدثین کے سامنے کسی اور کی کیا وقعت ہوگی؟ اور آپ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ یہ ائمہ حضرات کسی ایسے مسئلے پر اتفاق کر سکتے ہیں، جس کی اصل قرآن و سنت سے ثابت نہ ہو، حاشا و کلا! یہ آسمان کے نیچے ایک عظیم ترین خوف ناک بدگمانی ہے، جس کی سزا میں آدمی توفیقِ ہدایت سے محروم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ حضرات وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قرآن و سنت کی حفاظت و اشاعت میں لگا رکھا تھا، یہ دین کے حقیقی شارح و ترجمان ہیں، جن مسائل میں ان کے درمیان اختلاف ہو، وہاں تو ضرور گنجائش ہے کہ آدمی دلائل کی روشنی میں کسی ایک کو اختیار کرے اور دوسرے کو ترک کردے؛ لیکن جہاں اتفاق کامل ہو وہاں تو غلطی کا احتمال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ عام مسلمان اس کو سمجھیں، ورنہ آخرت کے سخت خسارے میں مبتلا ہوں گے۔ اول تو ایک مسئلۂ حق سے انحراف، دوسرے احادیث کی تکذیب یا بے معنی توڑ مروڑ، تیسرے ائمہ کبار کے حق میں بدگمانی و گستاخی، چوتھے پوری امت کے ایک غلط مسئلے پر متفق ہونے کا اتہام، پانچویں اپنے علاوہ سب کی گمراہی کا عقیدہ۔ بتایئے ان انبار در انبار گناہوں کو سر پر ڈال کر خدا کے حضور جانا کوئی مسلمان پسند کرے گا؟ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَالطُّغْيَانِ.

انتباہ: ایصال ثواب کی تفصیل آپ نے ملاحظہ فرمالی، بلا شبہ ایصال ثواب ایک ثابت

شدہ اجماعی مسئلہ ہے، اس میں شک کرنا معقولیت کے خلاف ہے؛ لیکن کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ فی زمانہ ایصالِ ثواب کے جو طریقے رائج ہیں، وہ سب بھی درست ہیں۔ کسی نیک عمل کا ثواب بیشک مُردے کو بخشا جاسکتا ہے، لیکن عوام الناس نے اس میں اپنی رائے سے جو تخصیصات اور قیدیں لگا رکھی ہیں، وہ غلط اور بدعت ہیں۔ مثلاً میت کا تیجہ، چہلم، برسی، اجتماعی قرآن خوانی، نیز ۱۴؍ شعبان، جسے عوام نہ جانے کس بنیاد پر عرفہ کا دن کہتے ہیں، اس دن غریبوں کو کھانا کھلانے کا اہتمام، یا ایصالِ ثواب کے کسی خاص طریقے پر اصرار و تاکید۔ یہ سب امور بدعت ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ انفراداً اپنے کسی نیک عمل کا ثواب مُردے کو بغیر کسی شرط اور قید کے بخش دیا جائے، کافی ہے۔ سامنے کھانا یا شیرینی رکھنا، اس پر مخصوص سورتیں پڑھنا، جب تک فاتحہ و نیاز نہ ہو لے، گھر کے کسی فرد کو کھانے کی اجازت نہ دینا، یہ لایعنی اور بدعت ہیں۔ ان امور کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔ ہم نے رفعِ اشتباہ کے لیے محض اشارہ کر دیا۔

❖◆◆❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

☐ باب دوم

جائزہ و احتساب

کتاب ’’ردِّ ایصال ثواب‘‘ کا اگر سرسری تجزیہ کیا جائے تو چار اجزا میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

(۱) مولف کا تعارف (۲) ایصال ثواب کا ابطال
(۳) ایصال ثواب کی دلیلوں کا جواب (۴) بدگوئی و دشنام طرازی

جہاں تک تعارف کا تعلق ہے، اس سلسلے میں ہمیں افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا ہے کہ جس کا مبلغِ علم اس قدر ہو کہ ناول سے ابتداء کر کے بات کتب دینی تک پہنچی ہو، اور مطالعہ بھی اصل عربی مآخذ و مصادر سے نہیں، بلکہ فقط تراجم کی مدد سے۔ تعجب ہے کہ اس ناقص مطالعہ پر ایسی ہمت و جرأت کہ صحیح احادیث کا انکار صریح۔ قرآن و حدیث جو علوم دین کے اصل مآخذ اور مصدر ہیں، ان کی بنیادی زبان عربی ہے۔ اور مولف اس سے ناواقف ہیں، وہ اردو تراجم کے سہارے چلتے ہیں، اور دینی علوم کی بے شمار بنیادی کتابیں ابھی اردو میں نہیں آسکی ہیں، نیز جتنی آسکی ہیں وہ اصل کا بدل بن جائیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ ابھی متعدد مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ پھر عامۃ المسلمین پر تعجب ہے کہ جو بات عیب کی ہے اسے کیوں کر ہنر سمجھا جانے لگا کہ ایک شخص محض اردو خواں ہے، عربی کی مبادیات سے بھی ناواقف ہے، اس کو یہ سمجھنا کہ وسعتِ مطالعہ کے باعث دینی مسائل پر بھی رائے زنی کے قابل ہوگیا ہے۔ بڑی عجیب بات ہے! مولف نے کتاب میں متعدد جگہ بطور فخر کہا ہے کہ ’’میرے جسم میں قوم کا ایک لقمہ نہیں گیا ہے، میں نے کسی مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔‘‘ ہماری گزارش ہے کہ کاش ان کو یہ

نعمت میسر ہوتی! کسی مدرسہ میں باقاعدہ اساتذہ سے تعلیم حاصل کئے ہوتے، تو یہ آگ کی طرح بھڑکتا ہوا تکبر، اور شعلے کی طرح لپکتی ہوئی انانیت، انھیں دعوئ ہمہ دانی کی جہنم میں نہ جلاتی۔ بڑی ڈھٹائی کی بات ہے کہ اپنی جہالت کے علم کے باوجود دینی مسائل پر نیشہ زنی کی جائے، بہرکیف چھوڑیئے۔ مولف خواہ کچھ بھی ہوں، ذرا ان کے دلائل کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ ان میں عقل کا استعمال کس حد تک ہوا ہے؟

مؤلف کی بیان کردہ مثال: مؤلف نے ایصال ثواب کے عقیدہ کو غلط کہا ہے۔ دلیل میں زیادہ تر قرآن کی آیت پیش کی ہیں؛ البتہ اس سے پہلے ایک مثال سے بھی ایصال ثواب کے بطلان کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ آیئے پہلے ہم بھی اسی کا جائزہ لیں گو کہ مثال ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے زیر بحث لایا جائے۔ تاہم چونکہ مؤلف کی خردمندی یہاں بھی نمود کرتی ہے؛ اسی لیے تھوڑی سی گفتگو اس پر بھی کرلی جائے، تو مضائقہ نہیں۔ ایصال ثواب کی مثال دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اور ایصال ثواب کی مثال یوں ہوسکتی ہے کہ اے اللہ! جو شکم سیری مجھ کو حاصل ہوئی ہے، اس کو فلاں بھوکے کے پیٹ میں منتقل فرمادے، یا یہ دعا فرمائیں کہ اے اللہ! میں نے جو گرم کپڑے پہن رکھے ہیں، اس کی گرمی ان میں بھی منتقل کردے، جو سردی سے کانپ رہے ہیں۔ یا یوں کہ یا اللہ! میں نے جو خمیرہ گاؤزباں کھا رکھا ہے اور اس کے عمل نے جو طاقت و قوت مجھے دی ہے، اس کو تو بیماروں اور کمزوروں کے جسم میں ڈال دے۔'' (ص:۴۳)

ایصال ثواب کی جو مثال اس عبارت میں بیان کی گئی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً ایصال ثواب غلط ہے۔ لیکن محترم ناظرین! ذرا ذہن پر زور ڈالئے اور دیکھئے کہ مؤلف کی سمجھ نے کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ اگر آپ نہ سمجھ سکے ہوں تو اساتذہ سے پڑھے ہوئے ایک شخص سے سنئے۔ کھانا کھانے سے شکم سیری حاصل ہوتی ہے، گرم کپڑے پہننے سے بدن گرم ہوجاتا ہے، خمیرہ گاؤزباں کھانے سے جسم کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ یہ شکم سیری، یہ بدن کی گرمی، یہ جسم کی قوت، اپنے اسباب کے نتائج ہیں۔ انھیں نتائج پر اعمال کے ثواب کو بھی قیاس کیا گیا

ہے؛ لیکن آپ فرق تو ملاحظہ کیجیے، کھانا کھانے کا نتیجہ وہیں ظاہر ہوا، جہاں کھانا پہنچا ہے۔ کپڑا پہننے کا نتیجہ وہیں نمودار ہوا ہے، جہاں کپڑا پہنا گیا ہے۔ خمیرہ گاؤزباں کھانے کا اثر وہیں تک ہے، جہاں تک خود خمیرہ ہے۔ بدن سے الگ اس کے نتیجہ کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ اس کے برخلاف عبادات کا ثواب نہ عبادت گزار کے بدن پر ہوتا اور نہ اس کی روح پر، حد تو یہ ہے کہ اس دنیا میں بھی نہیں؛ بلکہ آخرت میں ملے گا۔ اعمال کا ثواب عمل کرنے والے سے الگ ظاہر ہوتا ہے، اور آخرت میں بھی الگ ملے گا۔ اب آپ خود سوچ لیجیے کہ ایک نتیجہ عمل کرنے والے کی ذات سے جدا ہو ہی نہیں سکتا، اور ایک نتیجہ عمل کرنے والے سے بالکل الگ ظاہر ہوتا ہے، کیا دونوں کی مثال ایک ہوسکتی ہے؟ لیکن مؤلف کے اندر اتنی موٹی بات کے سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں معلوم ہوتی۔

صحیح مثال: اس کی صحیح مثال یہ ہوسکتی ہے کہ یا اللہ! میں نے اپنی محنت سے جو دولت کمائی ہے، اس میں فلاں کو بھی حصہ دار بنانا چاہتا ہوں، آپ کہیں گے کہ دولت تقسیم کرنے سے کم ہوجاتی ہے، اور ایصال ثواب سے ثواب کم نہیں ہوتا؟ ہم کہیں گے: بیشک آپ درست فرماتے ہیں؛ مگر دنیا کی چیز فانی ہے، اس لیے تقسیم سے کم ہوجاتی ہے، آخرت کا ثواب دائمی ہے، اس میں کم ہونے کا احتمال نہیں ہے، احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے؛ لیکن اس بات میں دونوں مشترک ہیں کہ عمل کرنے والے کی ذات سے الگ دونوں کا ظہور ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی کچھ چیزیں ایسی ہیں جو تقسیم سے کم نہیں ہوتیں، مثلاً علم ہے کہ اسے بانٹتے چلے جاؤ، اپنا علم کم نہ ہوگا۔ غرض صحیح مثال یہ ہے جو ہم نے عرض کی۔ مصنف کی بیان کردہ مثال تو ان کی عقل مندی کی آئینہ دار ہے۔

دلائل: اب آیئے، دلائل کا جائزہ لیں، مصنف نے جن دلیلوں سے کام لیا ہے، اجمالی طور پر ان کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کچھ آیات ایسی ذکر کی ہیں جن میں انبیاء، ملائکہ اور مومنین صالحین کی دعاؤں کا ذکر ہے اور ان میں ایصال ثواب مذکور نہیں ہے۔

(٢) پھر کچھ ایسی آیات تحریر کی ہیں جن کے عمومی معنی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک انسان کا کوئی عمل دوسرے انسان کے کام نہیں آسکتا اور نہ کسی کی برائی دوسرے انسان پر ڈالی جائے گی۔

مؤلف کا پہلا استدلال: پہلے مضمون کی بہت سی آیات ذکر کی ہیں، ہم سب کو تو یہاں نقل نہیں کر سکتے۔ صرف ایک عبارت بطور نمونہ کے ذکر کرتے ہیں، مؤلف کو آیات لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے، ہم آیت بھی لکھے دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ”دیکھئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کس طرح دعا کرتے ہیں: رَبِّ اغْفِرْ لِی وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِناً وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ. اے ہمارے رب! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور ان کو جو ایمان کی حالت میں میرے گھر میں داخل ہوئے اور اہل ایمان مرد اور عورتوں کو بخش دیجئے۔
>
> کیا کوئی ہے جو یہ کہے کہ حضرت نوح جیسے جلیل القدر پیغمبر کے پاس ثواب کی کمی تھی؟ مگر وہ جانتے تھے کہ ثواب منتقل کرنے والی چیز نہیں کہ کسی کے حوالہ کر دی جائے۔ (ص:۴۴)
>
> اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں محض دعا ہے اور ایصال ثواب کا ذکر نہیں ہے۔ پس ثابت ہو گیا ایصال ثواب ایک باطل عمل ہے۔

سبحان اللہ! اللہ کی قدرت ہے کہ ایسا نافہم انسان بھی قلم پکڑنا جانتا ہے۔ مؤلف سے تو ہم کیا کہیں؟ ناظرین کی خدمت میں عرض پیرا ہیں کہ دلیل کا یہ انداز دیکھ کر گو کہ کتاب سے سخت اذیت ہوئی تھی، مگر ہم اپنی ہنسی روک نہ سکے۔ کیوں؟ سنئے: ایک شخص کہتا ہے کہ میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں۔ مؤلف صاحب آئے اور منہ اٹھا کر کہا کہ اس سے ثابت ہو گیا کہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں زکوٰۃ ادا کرتا ہوں۔ مؤلف آئے اور ارشاد فرمایا کہ اس سے ثابت ہوا کہ آپ اہل وعیال کو خرچ نہیں دیتے۔ آپ سوچ لیجئے، ایسے شخص کی دماغی حالت کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے۔

ارے صاحب! دلیل کا مطلب یہ ہے کہ وہ دعویٰ کے اوپر ٹھیک ٹھیک منطبق ہو۔ مؤلف نے کہا کہ ایصال ثواب باطل ہے۔ ان کو چاہئے کہ ایسی آیت پیش کریں جو ایصال ثواب کے غلط ہونے کو صراحتاً یا اشارتاً ثابت کرتی ہو۔ یہ کیا کہ ایسی آیات لکھتے چلے گئے جن میں کچھ دعاؤں کا ذکر ہے اور ایصال ثواب سے سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ کیا سکوت ایسی جگہ بھی دلیل ہوتا ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ میں تو صرف کھانا کھاتا ہوں۔ تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ پانی پینا مذکور نہیں ہے؛ اس لیے ثابت ہوگیا کہ پانی نہیں پیتا۔ کس درجہ مسخرہ پن ہے! اس کو علم کہتے ہیں! بخدا اس طرز عمل کو علم کے ساتھ جوڑنا علم کی ایسی توہین ہے جو شاید علمی دنیا میں پہلی بار کی گئی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ شخص کس چیز کو دلیل کی جگہ میں پیش کررہا ہے؟ اگر اسی کا نام دلیل ہے تو دنیا میں کوئی بات بے دلیل نہیں ہے۔ ایک شخص آپ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ابھی نماز پڑھی ہے۔ آپ اس سے لڑائی کر لیجئے کہ تم نے وضو نہیں کیا تھا؛ کیوں کہ تم نے اس کو کہا نہیں۔ افسوس! اسی کا نام اس دور میں علم ہے۔

اس طرح تو آپ پورا قرآن پڑھ ڈالئے، کہیں ایصال ثواب کا ذکر نہیں آیا ہے، پھر کیا مشکل ہے صرف ایصال ثواب باطل نہ ہوگا، نماز کے پانچ اوقات بھی باطل ہو جائیں گے، روزہ کے بیشتر مسائل بھی باطل ہو جائیں گے، زکوٰۃ کی تمام مقداریں بھی باطل ہو جائیں گی۔ کیوں کہ تیس پاروں میں تلاش و جستجو کے بعد بھی یہ چیزیں نہ مل سکیں گی۔

ناظرین سمجھ لیں کہ سکوت موقعِ بیان پر دلیل ہوتا ہے۔ مثلاً شارع علیہ السلام کے سامنے شکار کیا گیا، آپ نے اس پر کچھ نہیں فرمایا، نہ تحسین نہ انکار، اس سے ثابت ہوا کہ شکار جائز ہے؛ کیوں کہ آپ صاحبِ شریعت ہیں، اگر شکار کرنا خدا کو ناپسند ہوتا تو ضرور آپ ارشاد فرماتے، بیان کا موقع تھا؛ لیکن آپ نے کچھ فرمایا نہیں، معلوم ہوا کہ یہ عمل جائز ہے۔

کچھ لوگ دعا کررہے ہیں، کچھ بھی دعا کر سکتے ہیں، اس کو قرآن نے بلا انکار نقل کیا، اس سے صرف اتنا ثابت ہوا کہ یہ دعا پسندیدہ ہے۔ کیوں کہ خدا نے موقعِ تحسین پر نقل فرمایا ہے، لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دعا ناجائز ہے۔ اگر

ثبوت کا یہی انداز ہے تو کوئی بتائے کہ ان آیات میں فقط دعائے مغفرت کی گئی اور کوئی دعا مذکور نہیں ہے۔ کوئی شخص اگر یہ کہتا ہوا اٹھے کہ صاحب! بجز دعائے مغفرت کے اور کوئی دعا جائز نہیں، کیوں کہ کسی اور دعا کا ذکر نہیں ہے۔ تو آپ کیا کر سکیں گے؟

مؤلف کا دوسرا استدلال: دوسرے استدلال کے ذیل میں مؤلف نے ایسی آیات کے ترجمے نقل کئے ہیں، جن کے عمومی معنی سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک کی سعی دوسرے کے کام نہیں آسکتی۔ اس کا بھی ایک نمونہ دیکھتے چلئے، لکھتے ہیں:

> ”آپ سورۃ النجم نکال کر یہ آیت پڑھئے، (۱)أَن لَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ، وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ.
> یہ کہ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا، اور یہ کہ انسان کو (ایمان کے بارے میں) صرف اپنی ہی کمائی ملے گی، اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھی جائے گی، پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا۔

یہ ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے۔ مؤلف کو اس پر اعتراض ہے کہ قوسین میں (ایمان کے بارے میں) والا اضافہ درست نہیں ہے۔ آیات قرآنی میں کم وبیش کرنے کا طریقہ اچھا نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”اللہ تعالیٰ کے احکام میں کسی ردّ وقدح کی گنجائش نہیں، وہ صاف لفظوں میں فرماتا ہے کہ انسان اپنی کمائی (نیکیوں) کے علاوہ کسی دوسرے کی نیکی نہیں پا سکتا، انسان وہی پائے گا جس کی اس نے کوشش کی ہو، اور اس کی سعی کا اس کو بھرپور صلہ دیا جائے گا، اور اس کی نیکی کو وہ بہت جلد دیکھے گا۔“
>
> صرف یہی ایک آیت ایصال ثواب کے تصوراتی پہاڑ کو ڈائنامیٹ کرنے کے لیے کافی ہے، اس لیے کہ قرآنی آیت کو روایات رد نہیں کر سکتیں۔ (ص:۵۲،۵۱)
>
> ”نہ وہاں کسی کی نیکی کسی کے حوالے کی جائے گی اور نہ کسی کی بدی کسی کے سر ڈالی جائے گی۔“

---

(۱) آیت ہم نے لکھی ہے، مؤلف آیات نہیں لکھتے، صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

قرآن میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں کہ آدمی جو بھلا یا بُرا عمل کرے گا، آخرت میں اس کا بدلہ پائے گا، ہر جان اپنے کرتوتوں میں گرو ہوگی، اس قسم کی بہت سی آیات جمع کر کے چیلنج کیا ہے، کہ یہ ساری آیات ایصال ثواب کو باطل کرتی ہیں۔ کسی کی نیکی دوسرے کے کام نہ آئے گی۔ ہم اس کے جواب میں کیا عرض کریں؟ مؤلف نے وہ کتابیں تو پڑھیں نہیں، جن سے بات سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

چند مثالیں: ایک فارسی مصرع تھوڑے سے تصرف کے ساتھ مؤلف کی خدمت میں پیش ہے:

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جا است
میرے پیارے! تم سخن فہم نہیں ہو، بس یہیں تمہاری غلطی ہے۔

خیر یہ تو مؤلف کی نذر ہے۔ ہمیں تو اپنے ناظرین سے گفتگو کرنی ہے، بات سمجھنے کے لیے چند مثالیں سنئے:

(۱) ایک صاحب کے پاس ایک مہمان آیا اور یوں آیا کہ ابھی لوٹنا ہے، میزبان نے اپنے خادم سے کہا کہ بازار جاؤ، نمکین، میٹھا کچھ لیتے آؤ۔ خادم گیا تو گیا، کافی دیر تک جب واپس نہیں آیا، اور ادھر مہمان کو عجلت تھی، مجبوراً میزبان نے دوسرے آدمی کو دوڑا کر کچھ سامانِ ضیافت منگایا، اور مہمان کو رخصت کیا۔ دیر کے بعد پہلا خادم جلیبی لے کر ہانپتا کانپتا آیا، میزبان نے ڈانٹا کہ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کہنے لگا: صاحب! آپ نے کہا تھا: نمکین، میٹھا لیتے آؤ، میں سارے بازار میں پھرتا رہا، کہیں ایسا میٹھا نہ ملا جو نمکین ہو۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دوکان پر یہ جلیبی چھن رہی تھی، میں نے چکھا تو نمکینیت کا احساس ہوا، بالآخر لے لیا۔ میزبان نے سر پیٹ لیا کہ ہائے رے بدفہم!

(۲) ایک شخص غسل خانے میں نہا رہا ہے، پانی کم ہوا، اندر سے پکارا، ارے فلانے! ذرا پانی لانا، وہ دوڑا ہوا گیا اور گلاس میں پانی لایا۔ آپ کیا کہیں گے! اچھا ایک شخص دسترخوان پر بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا ہے، حلق میں لقمہ پھنسا، پاس کے آدمی سے پانی مانگا، اس

نے بالٹی تھمادی۔ آپ کیا کہیں گے!

(۳) ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ آپ کتنے بھائی ہیں؟ اس نے جواب دیا: پانچ۔ پھر پوچھا: آپ ان میں بڑے ہیں یا چھوٹے؟ اس نے کہا: میں سب سے بڑا ہوں۔ بس پوچھنے والا بگڑ کر بولا: تم کافر ہوگئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ تم نے کہا کہ میں سے سب سے بڑا ہوں، حالانکہ سب سے بڑا تو اللہ ہے۔ اور تم نے اس سے بھی بڑے ہونے کا دعویٰ کیا۔ آپ بھلا کیا جواب دیں گے!

ان تینوں مثالوں میں ایک بات مشترک ہے کہ مخاطب نے بات سمجھی نہیں اور کچھ سے کچھ بنادیا، پہلا اس جنون میں مبتلا ہوا کہ مجھے کوئی ایسی مٹھائی تلاش کرنی چاہئے جو نمکین ہو، پانی والے نے صرف یہ سمجھا کہ مجھے پانی دینا ہے، اس نے موقع محل پر غور نہ کیا، ورنہ غسل خانے والے کو بالٹی میں اور دسترخوان والے کو گلاس میں پانی پیش کرتا، تیسرے شخص نے لفظ ''سب'' کو اتنا عام کردیا کہ اس کے دائرے میں خدا کو بھی پہنچادیا، حالانکہ کہنے والے کا منشا فقط اس قدر تھا کہ میں اپنے سب بھائیوں سے بڑا ہوں۔ اسی کو کہتے ہیں: بے عقلی، بدفہمی۔ اگر آپ غور کریں گے تو روزانہ اس قسم کی مثالوں سے آپ بھی دوچار ہوتے ہوں گے۔ اب سنئے کہ مصنف نے قرآن کی آیات سے اسی قسم کا بے تکا مطلب سمجھنے کی غلطی کی ہے۔

آیئے ہماری نقل کردہ آیات پر غور کیجئے۔ مؤلف کا خیال ہے کہ یہ آیت اپنے عمومی معنی کے ساتھ مراد ہے، اور اسی طرح جزاء وسزا کی تمام آیتیں اپنے عموم پر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کسی کی کوئی نیکی خواہ ایمان ہو یا عمل خیر، دوسرے کے حق میں نافع نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کسی کی کوئی برائی دوسرے کے اوپر نہیں لادی جاسکتی ہے۔ ان آیات کا مطلب ان کے نزدیک قطعی طور پر یہی ہے۔ اگر اس مطلب کے خلاف حدیث کوئی ایسا امر ثابت کررہی ہو، جس سے ایک کا ثواب دوسرے کے حق میں جارہا ہو، یا ایک کی برائی دوسرے کے سر پڑ رہی ہو، تو لازماً وہ حدیث غلط ہوگی۔ یا اس کا مطلب وہ نہ ہوگا جس کی بنیاد پر وہ آیت کے اس مطلب سے ٹکرارہی ہے۔ آپ کچھ سمجھے؟ ٹکراؤ آیت سے نہیں ہے، مؤلف کے بتائے

ہوئے مطلب سے ہے۔ اگر آیت کا وہ مطلب نہ ہو، جس کی بنیاد پر ٹکراؤ اور تصادم تھا تو تعارض آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔

تاہم پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ مؤلف کا یہ دعویٰ کس حد تک عقل وفہم پر مبنی ہے۔ آپ خوب یاد کر لیجئے کہ مؤلف اس بات کے مدعی ہیں کہ ایک کا نیک عمل دوسرے کے لیے نافع، اور اس کا برا عمل دوسرے کے لیے مضر نہیں ہے۔

دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَأَن لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَاسَعَىٰ، یعنی انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کمائی کی ہے۔ اور اس مضمون کی تمام آیات، نیز وَأَن لَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزۡرَ أُخۡرَىٰ یعنی ایک کا بار دوسرا نہ اٹھائے گا، اور اس مضمون پر مشتمل تمام آیات۔ چلئے مان لیا کہ ہر شخص کا معاملہ الگ الگ فیصل ہوگا، ایک کے عمل کا دوسرے پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اور ایصال ثواب کی بنیاد ظاہر ہے کہ یہی امکان ہے کہ ایک کے کام سے دوسرا مستفید ہو سکتا ہے، چھٹی ہوئی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔ اب آپ پوچھ سکتے ہیں کہ جب كُلُّ نَفۡسٍ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِيۡنَةٌ (ہر شخص اپنے اعمال میں گرو ہے) کا معاملہ بالکل عام اور قطعی ہے، تو کسی کی دعائے مغفرت ہی سے کیا نفع ہو سکے گا؟ آخر یہ دعا بھی تو دوسرے ہی کا عمل ہے، اس سے مُردے کو کیوں نفع پہنچنے لگا؟ واضح ہو کہ مؤلف دعاء مغفرت کی نفع رسانی کے قائل ہیں۔ اور اس لیے قائل ہیں کہ قرآن سے اس دعا کا ثبوت ہے۔ چلئے کچھ تو اُترے، ورنہ انھوں نے تو بہت صراحت سے کہہ دیا ہے کہ ”آیات قرآنی میں کم وبیش کرنے کا طریقہ اچھا نہیں ہے“ دیکھ لیجئے مؤلف نے خود قرآن کے ایک وسیع معنی میں کمی کی یا نہیں؟ قرآن تو کہتا ہے کہ کسی انسان کو بجز اس کی کوشش ومحنت کے اور کچھ نہ ملے گا۔ لیکن مؤلف نے اعلان کر دیا کہ نہیں، دوسرا آدمی دعاء مغفرت کرے تو گو کہ یہ مُردے کا عمل نہیں ہے، لیکن اس سے مُردہ کو فائدہ پہنچے گا، اور ممکن ہے کہ اس دعا کی وجہ سے اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں، اور جنت کے بلند درجات حاصل کر لے۔ دیکھا آپ نے مؤلف کو کتنی جلد اپنے دعوی سے دستبرداری کا اعلان کرنا پڑا۔ کاش! ہمیں اسی کتاب میں وہ یہ بھی بتا دیتے کہ ایک عام دعوی میں سے دعاء

مغفرت کو خارج کرنے کی کیا بنیاد ہے؟ انھوں نے تو نہیں بتایا، لیکن ہم بتاتے ہیں کہ مصنف کا یہ دعویٰ ہی سرے سے غلط ہے کہ اس آیت میں ''سعی'' سے مراد ہر قسم کی سعی ہے۔ اور آدمی کسی بھی قسم کی سعی میں دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر ان کا دعویٰ صحیح ہے تو دعاء مغفرت کا فائدہ کیسے پہنچ گیا؟

مؤلف کے پہلے دعویٰ پر نظر اور ایصال ثواب کی بنیاد قرآن میں:

اچھا چلئے، مؤلف کے اس دعوے کا کہ کسی کا نیک عمل دوسرے کے حق میں نہیں جا سکتا۔ اس کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا اَلَتْنٰهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْئٍ، كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ.
>
> اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ان کا ایمان میں ساتھ دیا ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیں گے اور ہم ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہ کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال میں محبوس رہے گا۔

اس آیت میں غور سے نظر ڈالئے، بتایا یہ جا رہا ہے کہ باپ ایمان کے ساتھ، تقویٰ اور اعمال صالحہ کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہے۔ لیکن اولاد جو مومن تو ضرور ہے؛ مگر عمل میں ان کا مقام فروتر ہے، تاہم حق تعالیٰ باپ کے حسن عمل کی برکت سے اولاد کو بھی جنت کے اسی مقام پر لے جائیں گے، جو باپ کے لیے مخصوص تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ باپ کے اعمال میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔ بیٹے ہی کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوگا۔ آپ بتائیے کہ اس کے نامۂ اعمال میں، اس کے درجات میں اضافہ کیوں کر ہوا؟ آخر باپ کے ہی عمل کا تو اس کو فائدہ ملا۔ ناظرین فیصلہ کرلیں کہ ایصال ثواب کا بنیادی نکتہ یہاں موجود ہے یا نہیں۔ اچھا اب مؤلف سے پوچھ لیجئے کہ آپ کے نزدیک تو دوسرے کا عمل مفید ہوتا ہی نہیں، آنکھ کھول کر دیکھ لیجئے کہ یہاں افادیت ہے یا نہیں؟ اب مؤلف بتائیں، ان کے دعویٰ اور اس آیت میں ٹکراؤ اور تصادم ہے یا نہیں؟ دعاء مغفرت کا انھوں نے استثناء کیا تھا، اب اس کا بھی استثناء کریں گے یا نہیں؟

اگر نہیں کرتے تو آیت قرآنی کا انکار کرنا ہوگا، اور اگر اس کو بھی عام دعویٰ سے خارج کریں گے تو ایصال ثواب کا مسئلہ تو حل ہوگیا؛ مگر ان کے دعویٰ کا کیا ہوگا؟ اس کی تصحیح کریں۔

مؤلف کے دوسرے دعویٰ پر نظر: آیئے اسی ذیل میں دوسرے دعویٰ پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں، مؤلف کا ارشاد ہے اور بالکل عام ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی برائی اپنے اوپر نہیں لے سکتا ہے، ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ دلیل یہ ہے کہ أَن لَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (ایک جان دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی) قرآن کھولئے، سورہ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ وَمَا هُمْ بِحَامِلِيْنَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِنْ شَيْئٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ.

اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ چلو اور تمہارے گناہ ہمارے ذمہ، حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں سے ذرا بھی نہیں لے سکتے۔ یہ بالکل جھوٹ بک رہے ہیں۔

اس آیت سے مؤلف کا دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن ابھی جلدی نہ کیجئے، اس آیت کے معاً بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالاً مَّعَ اَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ.

یہ لوگ اپنے گناہ اپنے اوپر لادے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور، یہ لوگ جیسی جیسی جھوٹی باتیں بناتے ہیں قیامت میں ان سے باز پُرس ضرور ہوگی۔

اس آیت سے مؤلف کا دعویٰ ڈھیر ہوگیا۔ یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن پر دوسروں کا گناہ لاد دیا جائے گا۔ مؤلف کی ناقص عقل تو ان دونوں آیات میں بھی تعارض اور ٹکراؤ دیکھ رہی ہوگی، لیکن خدا جانے اس جگہ وہ کیا کریں گے؟ آیت کا انکار کریں گے یا کوئی اور راہ اختیار کریں گے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس کو ہم یوں ہی چھوڑ دیں کہ مؤلف خود اس کو حل کریں، لیکن مؤلف سے کیا امید! اور ناظرین خلجان میں مبتلا ہوں گے۔ اس لیے مطلب ہم لکھے دیتے ہیں۔

پہلی آیت میں کفار نے یہ کہا ہے کہ تم بھی کفر کا راستہ اختیار کرلو، اور اگر خدا کے یہاں پکڑے گئے تو ہم تمہارا گناہ اپنے اوپر اوڑھ لیں گے اور تم صاف بچ جاؤ گے۔ خدا نے فرمایا کہ یہ ان کے گناہوں کو نہ اوڑھ سکیں گے۔ مطلب یہ کہ ان کے گناہوں کو اوڑھ کر بچالیں، ایسا ہرگز نہ کرسکیں گے۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ دوسری آیت کا منشا یہ ہے کہ کفار جو دوسروں کو کفر پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں، اگر کوئی ان کے کہے پر انھیں کی راہ چل پڑا تو اپنا گناہ تو لادیں گے ہی، ان اپنے پیروؤں کا گناہ بھی اٹھانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر یہ نہ ہوگا کہ ان کی وجہ سے ان مقلدین کی جان بچ جائے۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُوْنَ.
>
> تاکہ اٹھائیں اپنے گناہوں کو پورے طور پر اور ان لوگوں کے گناہوں سے جنھیں بغیر علم کے گمراہ کرتے تھے۔ سنو کہ بدترین گناہ میں مبتلا تھے۔

اس آیت میں بھی وہی بات کہی گئی ہے۔ اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ آیت أَنْ لَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا گناہ دوسرا اس طور پر اٹھالے کہ پہلے کی جان بچ جائے، ایسا نہ ہوگا۔ اور یہ نہ ہوگا کہ ایک کا گناہ خواہ مخواہ دوسرے پر لاد دیا جائے۔ آیت کا اگر یہ مطلب نہ ہو، بلکہ مؤلف کا بیان کردہ مطلب ہو تو قرآنی آیتوں میں اتنا ٹکراؤ ہوگا کہ مؤلف کے قابو سے بات باہر ہو جائے گی۔

قول فیصل: اتنی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى کا مطلب وہ نہیں ہے جو مؤلف مراد لے رہے ہیں کہ انسان صرف اپنی ہی سعی کے دائرے میں جزا پائے گا۔ پھر آیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں غور کرنے کے لیے ہماری ذکر کردہ پہلی آیت پھر پیش نظر رکھئے:

> وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ.
>
> اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کا ساتھ دیا ان کے ساتھ

ان کی اولاد شامل کریں گے۔

اس آیت میں اولاد کو باپ کے درجہ میں باوجود کوتاہی عمل کے، رکھنے کی بشارت جو دی گئی ہے، اس کی بنیاد ''ایمان'' کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی دولت سے اگر کوئی محروم نہ ہو تو دوسرے کے عمل سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایمان سے خالی ہو تو اس استفادے سے محروم ہوگا۔ اب یہ بات ثابت ہوگئی کہ وَأَن لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَىٰ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان سے محروم ہو تو اس کو دوسرے کا ایمان وعمل کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ یعنی یہاں ''سعی'' سے سعی ایمانی مراد ہے۔ اسی کی وضاحت حضرت مولانا تھانویؒ نے (ایمان کے بارے میں) کے الفاظ سے کی ہے۔ اب آپ خود بتایئے کہ یہ وضاحت ضروری ہے یا نہیں؟ کیا اس کو قرآن میں کم وبیش کرنا کہا جائے گا؟ اور مؤلف خود دعاء مغفرت کو مستثنیٰ کریں تو یہ کم وبیش کرنا نہ ہوا۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ مؤلف کو قرآن فہمی کی مطلق صلاحیت نہیں ہے، اگر ہر بات کا اوپری اوپری سپاٹ مطلب لیا جائے اور اس کے پس وپیش کو نظر انداز کر دیا جائے تو پورے دین کا کباڑا ہو جائے گا۔ مثال ملاحظہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ. اور جب تم سفر کرو تو تم پر کچھ حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو۔

اس آیت میں صرف اس قدر فرمایا گیا ہے کہ جب تم زمین پر چلو تو نماز میں قصر کر سکتے ہو، اس میں نہ تین دن کے سفر کا ذکر ہے اور نہ ۴۸؍ میل کا۔ اب مؤلف صاحب اٹھیں گے کہ قرآن میں کم وبیش کرنا جائز نہیں، اس لیے خواہ کتنی ہی مقدار زمین میں چلنا ہو، قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب مؤلف ہی جیسا دماغ رکھنے والے یہی کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دورِ صحابہ سے آج تک تمام امت کا اتفاق ہے کہ مطلق سفر مراد نہیں ہے؛ بلکہ ایک خاص مقدار کے سفر پر رخصتِ قصر حاصل ہوتی ہے۔

دوسری مثال لیجئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاايُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ الخ

اے ایمان والو! جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو دھولو الخ (یعنی وضو کرلو)

مؤلف کے اصول پر تو یہی فتویٰ ہوگا نا کہ آدمی جب بھی نماز کا ارادہ کرے، خواہ باوضو ہو یا بے وضو، اسے وضو کرنا ضروری ہے۔ اس میں یہ قید لگانا کہ اگر بے وضو ہو تب وضو کرنا ضروری ہوگا۔ قرآن میں کم وبیش کرنے کے مترادف ہوگا۔

بریں عقل ودانش بباید گریست

قرآن وسنت میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ الفاظ مطلق اور عام ہوتے ہیں؛ مگر مطلب مقید اور خاص ہوتا ہے۔ اس کو قرآن میں کم وبیش کرنا نہیں کہتے۔ اسے قرآن کی تفسیر کہتے ہیں۔ مگر مؤلف نے اردو کی چند کتابیں پڑھ لیں اور سمجھ لیا کہ میں دینیات کا ماہر ہوگیا۔ اول تو جناب کا علم ناقص در ناقص، پھر اس پر طرۂ کوتاہئ عقل وخرد۔ کوئی بات تو عقل کی کہی ہوتی۔

مؤلف کی عقل مندی کا ایک نمونہ: ہماری معروضات سے ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ عام پیرائے میں کہی گئی ہر بات بالکل عام نہیں ہوتی، بلکہ سیاق وسباق اور قواعد مسلّمہ کی بنیاد پر ان میں قیود وتخصیصات ملحوظ ہوا کرتی ہیں۔ اسی کو اہل اصول کی اصطلاح میں عام مخصوص منہ البعض کہتے ہیں۔ آیئے مصنف کی عقل مندی اور دیانت داری کی ایک مثال دیکھتے چلیں۔

موصوف کا دعویٰ ہے کہ ہر نفس خواہ وہ مومن ہو یا کافر، اپنے کرتوتوں میں ضرور پھنسے گا۔ دلیل میں یہ آیت ہے: **كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ**۔ ہر نفس اپنی کمائی میں گرو ہے۔ حالانکہ اس کے معاً بعد اللہ تعالیٰ نے **اِلَّا اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ** فرمایا ہے، یعنی مگر اصحاب یمین اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ کیوں بخشے جائیں گے؟ اس کی تفصیل خدا نے ذکر نہیں کی، لیکن مصنف نے اپنے مفید مطلب نہ پا کر اس جزء کو اڑا دیا۔

دوسرا نمونہ: مؤلف نے ایک اور آیت کا ترجمہ نقل کیا ہے، اور وہ بھی ناقص۔

آیت یہ ہے:

وَاتَّقُوْا یَوْماً لَّاتَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَیْئاً وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَایُؤْخَذُ مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَاھُمْ یُنْصَرُوْنَ.

اور ڈرو اس دن سے جب کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آسکے گا، اور نہ شفاعت قبول ہوگی، اور نہ فدیہ لیا جائے گا، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

مؤلف نے صرف ابتدائی جملہ کا ترجمہ نقل کر کے چیلنج بازی شروع کردی ہے، بدمزگی تو ہوگی لیکن صبر کر کے قدرے مصنف کی عبارت بھی ملاحظہ فرمایئے:

> ”روزِ حشر تمام انبیاء کرام وہیں ہوں گے، اولیاء ہوں گے، صالحین وشہداء ہوں گے، ان تمام کے ساتھ معصوم فرشتے بھی پرا باندھ کر کھڑے ہوں گے، اور ان حضرات کے ساتھ نیکیوں کے بڑے بڑے پہاڑ جو اگر مادی چیز ہو تو اس دنیا میں رکھنے کی جگہ نہ مل سکے۔ مگر فرشتے اللہ کے گناہ گار بندوں کو، انبیاء اپنی امت کو، اولیاء اپنے متبعین کو، شہداء واولیاء اپنی ملت کو گناہوں میں کھڑا ہوا دیکھیں گے، مگر اپنی ایک نیکی یا اس کا کوئی جزء بھی کسی گناہ گار کو نہ دیں گے، اور نہ دے سکیں گے۔ (ص:٦٤)

عقل مند مؤلف سے کوئی پوچھے کہ کیا انھیں آگے چل کر شفاعت کا بھی انکار کرنا مقصود ہے؟ اور ابھی ملت کی نبض دیکھ رہے ہیں کہ اس میں برداشت کی کتنی صلاحیت ہے؟ اگر ان کی یہ کتاب ہضم ہوگئی تو آگے انکارِ شفاعت کا اعلان کریں گے۔ بدگمانی کرنے کو جی تو نہیں چاہتا، مگر مصنف کی یاوہ گوئیاں اسی بات کی غمازی کر رہی ہیں کہ وَمَا تُخْفِیُ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ ابھی دل میں بہت کچھ ہے، میدان ہموار کیا جارہا ہے، تو بشارت ہو مؤلف کو، اب امت اتنی طاقت ور نہیں ہے کہ آپ کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکے، آپ جو جی چاہیں ارشاد فرمادیں، امت کے افراد نہ صرف ٹھنڈے پیٹ سے سن لیں گے بلکہ عجب نہیں آپ پر داد و تحسین کے ڈونگرے برس پڑیں، ہاں قوم کے پیسوں سے پڑھا ہوا کوئی مولوی ہمت کرے تو تو کرے لیکن خدا کے یہاں اپنا معاملہ سوچ لیجئے گا۔

مؤلف کو اسی آیت کے تحت چاہئے تھا کہ یہ بھی اعلان کردیتے کہ دیکھو مسلمانو!

اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق فرما دیا ہے کہ کوئی شفاعت قبول نہ ہوگی، چلو شفاعت کا بھی قصہ تمام ہوا، لیکن مصنف نے اسے نظر انداز کر دیا۔ تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں کہ کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا، کوئی شفاعت منظور نہ ہوگی، کوئی فدیہ قبول نہ ہوگا۔ ان سب کا تعلق اس حالت سے ہے جب کہ ایمان نہ ہو، ایمان ہونے کی صورت میں یہ معاملہ نہیں، اگر یہ تشریح منظور نہ ہو تو قرآن کی متعدد آیات سے انکار ضروری ہوگا۔

تیسرا نمونہ: مؤلف ایک جگہ چند آیات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں، آپ بھی ملاحظہ کریں، لکھتے ہیں:

> ''اور ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے، اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے، اور وہ درجہ بدرجہ بانٹیں جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں، ان کی آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان کے کرتوتوں کی گواہی دی۔ انھوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی؟ کہا جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔'' (سورہ حم سجدہ ۱۹ تا ۲۱)

ہم نے جب اس ترجمہ کو پڑھا تو ہمیں بڑی حیرانی ہوئی، قرآن کی جس آیت سے ابتداء کا حوالہ دیا ہے، وہ یَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللہِ (جس دن خدا کے دشمن) سے شروع ہوتی ہے، پھر ترجمہ کا پہلا جزء ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ مؤلف نے اس مقام پر اسے کیوں کر لکھ دیا، ذرا ذہن پر زور ڈالا تو یاد آیا کہ پہلا جملہ سورۂ یٰسین کی آیت کا ترجمہ ہے، مؤلف نے دونوں کو ایک سیاق میں جوڑ کر اپنی غنودگی کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ بہر کیف اس بات کو رہنے دیجئے، اصل مطلب کی بات مؤلف کی حسب ذیل عبارت ہے:

> ''حضرت مفتی صاحب بتائیں کہ ان آیات الٰہی کا اطلاق مسلمانوں پر ہے یا نہیں؟ اگر مثبت میں جواب ہے تو فرمائیے کہ آنکھ، ہاتھ، پاؤں اور کان تو اپنے انھیں کرتوت کا اعتراف کریں گے کہ آپ نے یا عام مسلمانوں نے ان سے جو خدمت لی ہے۔ اور

> اگر نفی میں جواب ہو تو سدّی، کلبی، آلوسی اور رازی جیسے مفسرین کی غلط تاویلوں سے باز آجایئے۔''

مفتی صاحب تو معلوم نہیں کیا جواب دیں گے، لیکن مؤلف پر سخت افسوس ہے کہ قرآن میں لفظ ''اعداء اللہ'' صراحۃً موجود ہے، معلوم نہیں مؤلف نے مومنین کو اللہ کا دشمن کیسے سمجھ لیا؟ کیا کوئی مومن بھی خواہ کتنا ہی خطا کار ہو، اللہ کا دشمن ہوسکتا ہے؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ یہ پورا رکوع پکار رہا ہے کہ روئے سخن کفار کی طرف ہے۔ مگر مؤلف مسلمانوں کی عداوت میں ایسا چور ہے کہ گناہ گار مومنین کو بھی اللہ کا دشمن بنا ڈالا۔ قرآن میں کہیں ایک لفظ ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس سے مسلمانوں کا دشمنِ خدا ہونا سمجھ میں آتا ہو۔ لیکن افسوس! واہ رے مؤلف! اپنی ناتمام عقل اور ناقص علم کے سہارے کھڑا ہو کر کس بے دردی کے ساتھ سدّی، کلبی، آلوسی اور رازی سب کو ایک لکڑی سے ہانک رہا ہے۔ ہمارا احساس ہے کہ ایسی جاہلانہ کتاب پڑھنے کا اتفاق ہمیں پہلی بار ہوا ہے۔ یہ کتاب تو اس لائق بھی نہیں ہے کہ اس کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا جائے، لیکن عوام کا خلجان دور کرنا بھی ضروری تھا، ورنہ غل ہوتا کہ قولِ حق وہی ہے جو مؤلف فرماتے ہیں۔ تھوڑا سا اور مؤلف کا زورِ بیان ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں:

> ''باوجود ان تمام قرآنی آیات کے مفتی صاحب قبلہ کے بارے میں یہ مشکوک خیال قائم ہے کہ وہ ایصال ثواب کے بے کار محض اور لغو ترین غیر قرآنی عقیدہ سے دستبردار نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ ان کے سامنے صدیوں کے فقہاء وائمہ، مولوی ومفتی وصوفی، حلوے مانڈے کے خوانِ نعمت کے ساتھ کھڑے ہوں گے، ظاہر ہے کہ ایک جانب تنہا قرآن برطاق اور دوسری جانب لاکھوں عوام وخواص، پھر ایک کے مقابلے میں لاکھوں، کروڑوں کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟''

اللہ اللہ یہ غرورِ علم! قرآن فہمی کا حال تو وہ ہے جو ابھی آپ نے دیکھا اور اسی بنیاد پر صدیوں کے فقہاء وائمہ، مولوی ومفتی وصوفی کو صلواتیں سنائی جارہی ہیں۔

ایک اصولی بات: یہ اصولی بات یاد رکھئے کہ قرآن میں بنیادی طور پر تین گروہوں کا ذکر ہے: مومن، کافر، منافق۔ وعیدیں سب کفار ومنافقین کے لیے ہیں، اور

بشارتیں سب مومنین کے لیے۔ پھر مومنین کی دو قسمیں ہیں: گناہ گار اور پاکباز۔ اصولی طور پر صراحتاً قرآن میں یہ تقسیم نہیں ہے، اشارۃً البتہ کہیں کہیں ذکر آیا ہے، لیکن وعید کے پیرائے میں مومنین کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ قرآن کو نظر غور سے مطالعہ کرنے والے پر یہ بات مخفی نہیں ہے؛ اس لیے وعید اور دھمکیوں کے ذیل میں مسلمانوں کو گھسیٹ لانا انداز قرآنی سے بے میل بات ہے۔ البتہ کافروں کی صفات پر وعیدیں سنا سنا کر مسلمانوں کو اس سے احتراز واجتناب کا سبق دینا ضرور مقصود ہے۔‘‘

مؤلف کو چونکہ فہم قرآن سے مس نہیں ہے، اس لیے وہ تمام آیتیں جن کا تعلق کفر و ایمان سے ہے، اٹھا اٹھا کر ایصال ثواب کی تردید میں پیش کرتے چلے گئے۔ کاش کہ مؤلف قرآن پاک کا ترجمہ کسی معتبر عالم سے پڑھ لیے ہوتے تو اکابر ائمہ کے اوپر کیچڑ اچھالنے سے محفوظ ہو جاتے۔ لیکن این سعادت بزورِ باز و نیست۔

ترجمہ کی غلطی: مؤلف نے ص: ۵۷ پر آیت وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ. کا ترجمہ یہ لکھا ہے:

’’اور جو کچھ تم اپنے آگے بھلائی بھیجو گے ’’اسی کو‘‘ اللہ کے پاس پاؤ گے‘‘

اس ترجمہ میں لفظ ’’اسی کو‘‘ لا کر مؤلف یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ قیامت کے دن صرف اپنا ہی کیا ہوا عمل نافع ہوگا، دوسروں کا نہیں۔ مصنف چونکہ عربی نہیں جانتے ہیں، اس لیے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے جان بوجھ کر ترجمہ میں خیانت کی ہے، البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ جو عربی نہ جانتا ہو وہ قرآن کا ترجمہ کرنے کی ہمت نہ کرے اور اگر ضروری ہو تو کسی معتبر عالم کا ترجمہ نقل کر دے۔ یہاں ’’اسی کا‘‘ لفظ بالکل بے محل ہے۔ اوپر سے اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو، اور جو تم اپنے آگے بھلائی بھیجو گے اس کو خدا کے پاس محفوظ پاؤ گے۔ مطلب یہ ہوا کہ نیکی ضائع نہ ہوگی۔ اور مؤلف نے اللہ کے کلام میں ناجائز طور پر اپنی بات ڈال دی، جس سے آیت کا مفہوم ہی بدل گیا۔ یہ تو قرآن میں تحریف ہے۔

مؤلف چونکہ عموماً آیات کے الفاظ نہیں لکھتے، اس لیے ناواقفوں کے سامنے ترجمہ

کی کھلی بازی واضح نہ ہو سکے گی، اسی لیے علماء نے مجرد ترجمہ لکھنے سے منع کیا ہے کہ دانستہ بھی اور نادانستہ بھی تحریف وتبدیل کا دروازہ کھل جائے گا۔ اگلی امتوں کی کتابیں انھیں تراجم کی وجہ سے ضائع ہو گئیں۔ یہاں بے ساختہ ہمیں مولانا ابوالحسن علی ندوی یاد آئے، انھوں نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ”عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے، اگر آپ کو علوم اسلامیہ پر کوئی کام کرنا ہے تو یہ بڑے نقص کی بات ہوگی کہ آپ عربی سے ناآشنا ہوں، قرآن، حدیث اور اسلامیات پر لکھنے والے بہت سے مشرقی اور مغربی فضلاء سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے نادانستہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے، جو بعض اوقات ان کے پورے علمی کارنامے پر پانی پھیر دیتی ہے۔
>
> مجھے ایک دوست نے بتایا کہ دہلی میں کوئی سیمینار ہو رہا تھا، اس میں ایک صاحب جنھوں نے انگریزی میں قرآن کا ترجمہ کیا تھا، تقریر کر رہے تھے، تو مشہور عرب ادیبہ اور مؤرخہ عائشہ بنت الشاطی نے، جو اس سیمینار میں شریک تھیں، ان سے عربی میں خطاب کیا تو انھوں نے تکلفی سے کہا کہ میں عربی نہیں سمجھتا، تو عائشہ نے کہا کہ قرآن مجید کا ترجمہ پھر آپ کیسے کرتے ہیں؟ اس کے بعد وطن جا کر انھوں نے مصر کے کثیر الاشاعت اخبار ”الاہرام“ میں اس پر کئی قسطوں میں مضمون لکھا کہ میں نے عجائبات عالم میں سے ایک عجیب چیز یہ دیکھی ہے کہ ایک فاضل نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور وہ عربی سے ناواقف تھا۔“ (اسلام تغیر پذیر دنیا میں)

اس غریب مؤرخہ کو کیا معلوم کہ ہندوستان میں یہ عجیب چیز اتنی کثرت سے ہے کہ اب نہ صرف یہ کہ یہ کوئی قابل حیرت چیز نہیں ہے، بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ میں عربی نہیں جانتا، لیکن اس کے باوجود علوم اسلامی پر سند ہوں۔ عربی جاننے والوں نے کچھ نہیں سمجھا، میں سمجھتا ہوں۔ حیرت ہے کہ حدیث کو ناقابل اعتبار قرار دینے والا شخص محض تراجم پر کیسے اعتماد کر لیتا ہے؟ کیا ان میں احتمال نہیں ہوتا کہ مترجم نے غلط ترجمہ کر دیا، یا مطلب الٹ دیا ہو؟ نیز یہ کہ انھیں تراجم کی مدد سے تیار شدہ عقل اور علم کیوں کر قابل اعتماد بن سکتا ہے۔ مسلمانو! خدا را اپنے اوپر رحم کھاؤ اور اپنے دین کے باب میں ہرایرے غیرے کی بات پر کان نہ دھرو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

❑ باب سوم

مؤلف کے انتقادات

مصنف کے انتقادات: اب آیئے ان اعتراضات کا جائزہ لے لیں جو ایصال ثواب کے حق میں پیش کی جانے والی دلیلوں پر بزعم خود مؤلف نے وارد کیے ہیں۔ انھیں پڑھ کر بھی آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ مؤلف موصوف سخن فہمی کی ابتدائی عقل سے بھی تہی دامن ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ مؤلف نے مفتی جمیل احمد نذیری سے پنجہ آزمائی کی ہے، اور کتاب انھیں کے فتویٰ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ فتویٰ ہمارے سامنے نہیں ہے، مؤلف کی عالی دماغی کا یہ بھی ایک نمونہ ہے کہ استفتاء تو مکمل حوالۂ کتاب کیا ہے، اور جواب میں سے چند اقتباسات۔ حق تو یہ تھا کہ پورا فتویٰ نقل کرتے، پھر تنقید فرماتے، تاکہ اہل نظر دونوں کا موازنہ کر سکتے۔ مگر مؤلف کے غرور و کبر کا پارہ شاید اتنا چڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو قول محکم اور حرف آخر سمجھتے ہیں۔ ان کا گمان شاید یہ ہے کہ میرے نوکِ قلم سے جو کچھ ٹپک جائے گا، ہر شخص بے چون و چرا اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا؛ اس لیے اس کی ضرورت ہی نہیں کہ مفتی کا فتویٰ منظر عام پر لایا جائے۔ البتہ اپنی تنقید کو اجاگر کرنا ضروری تھا۔

حضرت علی والی روایت پر اعتراض: اب آپ اصل فتویٰ کہاں ڈھونڈھیے گا، ہماری کتاب کا باب اول کھول کر ساتویں حدیث پڑھیے، اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عمل منقول ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کی جانب سے ہر سال قربانی کیا کرتے تھے۔ اس پر مصنف کو تین اعتراض ہیں:

(۱) یہ حدیث امیر نہیں غریب ہے۔ (۲) یہ حضور ﷺ کی وصیت پر عمل ہے۔

(۳) رسول اللہ ﷺ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں، اس لیے مُردہ کے لیے ایصال ثواب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ تینوں اعتراضات اس درجہ لغو اور لچر ہیں کہ کسی اہل علم کی طرف ان کا انتساب بھی قابل شرم ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اس پر کیا لکھیں؟ سب سے پہلے تو حدیث پر استہزائی جملہ کہ یہ ”حدیث امیر نہیں غریب ہے“ کسی ایسے شخص کی زبان وقلم سے نکل ہی نہیں سکتا، جس کے دل میں کچھ بھی خوف خدا ہو۔ ”حدیث غریب“ محدثین کا اصطلاحی لفظ ہے، اس کے مقابلے میں امیر کا لفظ لانا، درحقیقت علم حدیث کے ساتھ تمسخر ہے، جو شخص اتنا غیر سنجیدہ اور لاغی ہو، اسے کیا حق ہے کہ کسی سنجیدہ، علمی و دینی موضوع پر اظہارِ خیال کرے۔

پھر مؤلف کا یہ اعتراض بھی لغویت کا شاہکار ہے کہ کیا ”غریب حدیث سے عقیدہ بن سکتا ہے؟“ بندۂ خدا! غریب حدیث سے کون عقیدہ وضع کر رہا ہے؟ اس عقیدہ کی پشت پر تو قرآنی آیت، بہت سی صحیح احادیث اور اجماع امت کی طاقت کارفرما ہے۔ اگر ان سب کی تائید میں غریب حدیث بھی پیش کر دی گئی تو آپ نے باقی دلائل سے آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ اور اچھل پڑے کہ یہ حدیث غریب ہے، تُف ہے اس عقل وفہم پر۔

مؤلف کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کی وصیت پر عمل ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم مؤلف کو کیا سمجھیں؟ یہ بات تو ان کے کیس کو اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہے نا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو قربانی کی صورت میں ایصال ثواب کی وصیت کی تھی۔ اس اعتراض کی بنیاد پر ایصال ثواب کیوں کر باطل ہوا؟ کیا حضور ﷺ کے وصیت کر دینے کی وجہ سے قربانی ثواب کا عمل نہیں رہی، یا حضرت علی اس کے ثواب سے محروم ہو گئے، یا حضور ﷺ کو اس کا ثواب نہیں پہنچا؟ حیرت ہے!

پھر خواہ مخواہ مؤلف یہ بھی کہنے لگے کہ دور صحابہ (۱) میں ایک جانور سے زیادہ کوئی قربانی کرتا ہی نہ تھا۔ یہاں بھی مصنف سے وہی غلطی ہوئی ہے، جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں،

---

(۱) اس کے متعلق مؤلف نے حضرت ابو ایوب اور امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

کہ بات سمجھنے کا موصوف کو سلیقہ نہیں، ورنہ اس کے کیا معنی کہ ترمذی شریف سے وہ روایت تو اٹھالائے جس میں ایک سے زیادہ جانور کی قربانی کی نفی ہے، اور وہیں آس پاس وہ احادیث نہ دیکھ سکے جن میں صراحۃً ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو مینڈھوں کی قربانی فرمائی۔ اصل بات یہ ہے کہ دورِ صحابہ میں بھی کئی قربانیاں کی جاتی تھیں، مگر عموماً ایک ہی ہوتی تھی۔ بعد میں اس کی کثرت ہوگئی۔ حضرت ابوایوب کا منشا یہ ہے کہ اس کثرتِ قربانی کے پیچھے فخر ومباہات کا جذبہ بھی کارفرما ہوجاتا ہے، اس پر اعتراض مقصود ہے، ورنہ تو صحیح روایات سے خود رسول اللہ ﷺ کا سو (۱۰۰) اونٹوں کا قربانی کرنا منقول ہے۔

پھر ناانصافی تو ملاحظہ کیجیے، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ اور ابن شہاب زہری کا قول مل گیا تو اس کے بل بوتے پر صحیح مرفوع روایات کی تکذیب پر تُل گئے۔ فرماتے ہیں:

> ''حجۃ الوداع میں حضور ﷺ نے سو اونٹوں کی قربانی کی، یہ بات بعید از عقل وقیاس ہے۔'' (ص:۸۲)

کیوں صاحب! اگر کوئی الٹ کر پوچھ دے کہ سو اونٹ قربانی کرنے کی روایت صحیح مسلم میں ہے، مرفوع ہے، (۱) اور زہری کا قول ایک تابعی کا قول ہے، لہذا مرفوع روایت کے مقابلے، قولِ تابعی ناقابلِ اعتبار؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ مؤلف نے فرض کر رکھا ہے، میری بات کی جس سے تائید ہو وہ صحیح اور باقی سب غلط۔ ورنہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ قول تابعی اور حدیث مرفوع میں کوئی تصادم ہی نہیں۔ ایک عموم کی نفی کرتی ہے اور ایک خصوص واقعہ کی صراحت کرتی ہے، لیکن روایات کے سمجھنے کے لیے فہم درکار ہے، جس سے مؤلف کا مغز خالی ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں، لہذا مردہ کے لیے ایصال ثواب کی گنجائش اس روایت سے نہیں نکالی جاسکتی۔ مؤلف کی عقل بلند پایہ کا ایک بے مثال نمونہ یہ اعتراض بھی ہے۔ ہم بتکرار بتا آئے ہیں کہ ایصال ثواب کی بنیاد زندگی

---

(۱) مرفوع کا مطلب یہ ہے کہ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

اور موت پر نہیں ہے، ایک کے عمل سے دوسرے کے استفادے پر ہے۔ اگر کسی روایت سے یہ ثابت ہو گیا کہ زندہ کے لیے ایصال ثواب ہو سکتا ہے تو خود بخود اس کا بھی ثبوت ہو گیا کہ مردہ کے لیے بھی ایصال ثواب درست ہے۔ مؤلف بتائیں کہ کیا ایصال ثواب کی علت زندگی ہے؟ اگر زندہ ہونا علت ہے تو کیوں ہے؟ اس کو بھی واضح فرما دیا ہوتا۔ ابتداء کتاب میں خود مؤلف نے بھی ایصال ثواب کی بنیاد وہی بتائی ہے، جو ہم نے عرض کی اور شد و مد سے اسی کا انکار کیا تھا، مگر یہاں نہ جانے انھیں کیا ہو گیا کہ زندگی اور موت کی بحث لے پڑے، اس غیر متعلق بحث چھیڑنے سے انھیں کیا ملا، بجز اس کے کہ اپنے اوپر لوگوں کو ہنسنے کا موقع دے رہے ہیں۔

پھر اسی درمیان ایک اور غیر متعلق بحث لے بیٹھے، وہ یہ کہ حضور ﷺ زندہ ہیں، اور اے مفتی! تم نے انھیں مردہ کہہ دیا۔ اب ایسے عقل کے پورے آدمی سے کوئی بات کہنی بھی مشکل ہے، نہ جانے کیا سے کیا لے بیٹھے؟ حضور ﷺ بے شک زندہ ہیں، جیسی بھی حیات آپ کی ہو، لیکن یہ تو فرماؤ کہ آپ کے جسد اطہر سے روح نکالی گئی تھی یا نہیں؟ آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے کہ نہیں؟ آپ قبر شریف میں دفن کئے گئے یا نہیں؟ آپ پر صورت موت طاری ہوئی یا نہیں؟ کیا ان باتوں میں امت میں کسی کا اختلاف ہے؟ پھر قرآن شریف میں آپ کے متعلق اِنَّکَ مَیِّتٌ وارد ہے یا نہیں؟ اس بنیاد پر اگر کسی نے بَابُ الْاُضْحِیَّةِ عَنِ الْمَیِّتِ کے تحت یہ حدیث ذکر کی تو اس میں طوفان مچانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ بے شک قبر شریف میں زندہ ہیں، لیکن صورت موت آپ پر طاری ہوئی ہے، اس لیے کسی موقع پر اگر کسی نے میت کا اطلاق کر دیا تو غوغا مچانا دانش مندوں کا کام نہیں۔

کچھ اور اعتراض: مؤلف کے اقتباسات کے مطابق مفتی جمیل احمد نذیری نے چند اور حدیثیں ایصال ثواب کے ثبوت میں پیش کی ہیں:

(۱) ایک روایت تو وہی ہے جسے ہم نمبر (٦) میں لکھ آئے ہیں۔

(۲) ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے ایک مینڈھے کی قربانی فرمائی، اور فرمایا:

> ”یہ میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے ہے، جنھوں نے قربانی نہیں کی ہے۔“ (ترمذی)
>
> (۳) بخاری و مسلم کی روایت ہے:
>
> ”حضرت جابر نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ایک گائے ذبح کی قربانی کے دن۔“
>
> (۴) ایک اور روایت:
>
> حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی۔

ان چاروں روایتوں پر مؤلف کا مشترک اعتراض یہ ہے کہ ان میں مردہ کی طرف سے قربانی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس اعتراض کی حقیقت ہم واضح کر چکے ہیں۔

عجیب سمجھ ہے: دوسری روایت کے سلسلے میں مؤلف کو مزید ایک اور اعتراض ہے، انھیں کے الفاظ میں سنئے:

> ”اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کے ان لوگوں کی طرف سے قربانی کی، جو صاحب استطاعت نہ تھے، اور نہ اس میں ”میری طرف“ کے الفاظ ہیں، نہ ”میری امت“ کے، اور نہ ہی ”آل محمد“ کے، اور زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کی خصوصی حیثیت تھی کہ آپ نے اپنی امت کے ان غرباء و مساکین کی طرف سے قربانی کی، جو قربانی کی استطاعت ہی نہ رکھتے تھے۔“ (ص: ۸۰)

اس اقتباس سے اگر آپ کے ذہن و دماغ کا ذائقہ بگڑ گیا ہو تو ہمیں معذور کہئے۔ کیا کریں سابقہ ہی ایسے شخص سے پڑ گیا ہے کہ جسے کوئی ڈھنگ کی بات کہنے کا شعور نہیں ہے۔ اس روایت میں میری طرف کے الفاظ نہیں، میری امت کی طرف کے الفاظ نہیں ہیں، آل محمد کے الفاظ نہیں ہیں۔ تو اس استدلال پر کیا اثر پڑا؟ اور کیا ”میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے“ کے الفاظ آپ کی امت کے لیے نہیں ہیں؟ شاباش! ناول بیں شاباش! تم

نے تو وہ گل کھلائے ہیں کہ کیا کسی نے کھلائے ہوں گے!

پھر زیادہ سے زیادہ والی بات بھی عجیب وغریب ہے۔ کم سے کم کیا کہا جاسکتا ہے، وہ بھی ارشاد فرمادیئے ہوتے تو بہتر ہوتا۔ خصوصی حیثیت کیسے ثابت ہوگئی؟ ایک طرف تو اتنی ضد کہ صحیح احادیث کی بھی آپ کی نگاہِ ناز کے سامنے قربان ہوجائے، اور ایک طرف اتنا توسع اور حسنِ ظن کہ اپنا ایک قیاس جڑ دیا اور فیصلہ ہوگیا۔ البتہ تیسری اور چوتھی روایت اگر فتویٰ میں اسی طرح درج ہے، جیسے مؤلف نے تحریر کیا ہے تو ہمارے نزدیک ایصالِ ثواب کے حق میں اس سے استدلال درست نہیں۔

دو لطیفے: اسی روایت کے ذیل میں مؤلف مزید گل افشانی فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’مفتی صاحب نے ترمذی کی یہ روایت نقل کی ہے، بعض اہل علم نے مردہ کی قربانی کی اجازت دی ہے الخ۔ وہ بعض اہل علم جنھوں نے مردہ کی طرف سے قربانی کی اجازت مرحمت فرمائی، کون ہیں؟ ہم تو ان سے واقف نہیں ہیں۔‘‘ (ص: ۸۷)

ان سے غلطی ہوئی کہ انھوں نے آپ سے اپنا تعارف نہیں کرایا، جانے دیجئے، معاف کردیجئے، آئندہ کسی اہل علم کو ایسی کوئی بات کہنی ہوگی تو آپ کے گھر آکر اپنا نام لکھا جائے گا۔ لاحول ولاقوۃ!

اور پہلا لطیفہ تو آپ نے چھوڑ ہی دیا، امام ترمذی اپنی بات پیش کررہے ہیں، وہ روایت نہیں ہے۔ مگر ہمارے مولف اسے بھی روایت ہی سمجھ رہے ہیں، شاید مؤلف نے ’’عبارت‘‘ کا لفظ لکھا ہو، کاتب نے اسے ’’روایت‘‘ بنادیا ہو۔ چلئے عذر معقول ہے۔

علامہ شامی پر اعتراض: لکھتے ہیں:

> ’’اور مفتی صاحب! آپ نے علامہ ابن عابدین شامی کا جو فتویٰ نقل کردیا ہے، وہ عقل سلیم کے لیے ناقابل فہم ہے۔ آپ ان کا فتویٰ نقل کرتے ہیں:
>
> اگر مردہ کی طرف سے اس کا وارث، اس کے حکم (یعنی وصیت) سے قربانی کررہا ہے تو قربانی کا سارا گوشت صدقہ کرنا لازم ہے، اس میں سے کھا نہیں سکتا، اور اگر بغیر مردہ کے

> حکم اور وصیت کے بطور تبرع اپنی طرف سے قربانی کر رہا ہے تو اس کے کھانے کی اجازت ہے؛ کیوں کہ یہ قربانی ذابح کی ملکیت پر ہوگی، اور ثواب مردہ کو ملے گا۔ (فتویٰ ۲۳)
>
> یہ فتویٰ حضور ﷺ کی رحلت کے ۱۲۴۱/ برس بعد، علامہ ابن عابدین شامی نے دیا ہے، جس کو آپ نے اپنی تائید میں نقل کیا ہے، اب علامہ شامی کے فتویٰ کو سامنے رکھ کر ذرا یہ بتائیں کہ جو لوگ اولیاء اللہ یا اپنے مردہ ماں باپ کے نام پر برائے ایصال ثواب صدقہ و خیرات کرتے ہیں، وہ کس کی ملکیت پر واقع ہوتا ہے..... اگر مردہ کی طرف سے صدقہ وخیرات کیا ہوا کھانا ناجائز ہے تو مردہ کی طرف سے قربانی کا گوشت کیوں کر جائز ہو گیا؟ اس فرق کو کسی معقول طریقہ سے ثابت کیجیے۔ علامہ شامی کا فتویٰ تو عقل وبصیرت قبول کرنے کو تیار نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ فتویٰ گوشت خوری کے لیے لکھا گیا ہے، جس میں معقولیت کا دور دور پتہ نہیں۔'' (مختصراً ص: ۸۸، ۸۹)

محترم! آپ تو ہینڈ لوم ہی چلاتے اور علم کے میدان میں دوڑنے کی کوشش نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ علامہ شامی کی بات سمجھنے کے لیے عقل سلیم کی ضرورت ہے، اور آپ کا کاسۂ سر اس جوہر لطیف سے یکسر خالی ہے۔ آپ کس شان سے لکھ رہے ہیں کہ یہ فتویٰ حضور ﷺ کی رحلت کے ۱۲۴۱/ سال بعد لکھا گیا ہے، ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کی کتاب حضور ﷺ کی رحلت کے کتنے دن بعد عالم وجود میں آئی، کبھی اس کو بھی گنا۔ اگر بُعدِ مدت کوئی قابل اعتراض چیز ہے تو آپ کا یہ رسالہ خود آپ کے اعتراض کی زد میں ہے۔ پھر آپ کے ذہن و دماغ کی گندگی انتہاء کو جا پہنچی، جب آپ کا قلم یہ نجاست اگل رہا تھا کہ یہ فتویٰ گوشت خوری کے لیے لکھا گیا ہے، علامہ ابن عابدین کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوشت نہ ملتا تھا، بس مردہ کے ایصال ثواب کی قربانی کا گوشت کہیں سے آ گیا تھا اور جھٹ انھوں نے فتویٰ دے کر جائز کر لیا۔ آپ کی عبارت پڑھ کر غیرت مندی کو جلال آ گیا؛ لیکن کیا ہو سکتا ہے؟

قہر درویش بر جان درویش۔

اب ہماری بحث چڑیے جیسی عقل تو سمجھے گی نہیں، اس لیے ہم ناظرین سے سلسلۂ

کلام جاری رکھتے ہوئے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ ابن عابدین شامی نے مردہ کی جانب سے قربانی کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک وہ جس کی مردہ نے وصیت کی ہو، دوسرے وہ جس کی وصیت نہ کی ہو۔ اب مسئلہ سنئے: مرنے والا جب کوئی وصیت کرتا ہے تو اس کی وصیت کل مال کے ۱/۳ (ایک بٹا تین) حصے میں پوری کرنی واجب ہوتی ہے، اتنا حصہ وصیت کی صورت میں مرنے والے کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتا۔ باقی ۲/۳ (دو بٹا تین) حصہ وارثوں کی ملکیت میں آجاتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص نے تین ہزار کی رقم مرنے کے بعد چھوڑی، اور وصیت کر گیا کہ عید قرباں کے موقع پر میری جانب سے ایک قربانی کر دی جائے، وارثوں نے ایک ہزار کا جانور خریدا، یہ جانور مرنے والے کی ملکیت میں ہے، چونکہ یہ قربانی مرنے والے کی ملکیت پر ہو رہی ہے، اور اس کا مقصد صدقہ ہی تھا، اس لیے وہ بحکم صدقہ ہے، اور اس کا گوشت محض فقراء و مساکین ہی کھا سکتے ہیں۔ اور اگر میت نے وصیت نہیں کی ہے، کوئی شخص محض تبرعاً اپنے مال سے جانور خرید کر میت کے نام سے قربانی کرتا ہے، تو چونکہ یہ قربانی ذابح کی اپنی ملکیت پر ہوئی ہے، اس لیے صدقہ وخیرات کے حکم میں نہ ہوگی، قربانی ہی کے حکم میں رہے گی، اس لیے اس کا گوشت ہر کوئی کھا سکتا ہے۔ البتہ ثواب میت کو پہنچے گا۔ کتنا واضح اور معقول فرق ہے، لیکن سمجھ میں کیسے آئے، دروازہ ہی بند ہے۔

قاضی قطر کا حوالہ: آخر میں قاضی عبداللہ بن زید المحمود کی ایک عبارت سے استدلال کرتے ہیں، عبارت یہ ہے:

> ”ایک رواج لوگوں میں یہ چل پڑا ہے کہ لوگ اپنے مرحوم ماں باپ کی طرف سے قربانی کیا کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ قربانیاں ان کے مرحوم والدین کی طرف سے انجام پاتی ہیں، ایسوں کو چاہئے کہ والدین کی طرف صدقہ وخیرات کیا کریں نہ کہ قربانی۔“

ہم کہتے ہیں کہ قربانی کے مسئلے کو رہنے دیجئے، اس میں تو اختلاف ہے اور ہم اس کے ثبوت کی کاوش میں نہیں ہیں، ہمیں یہ بتلانا منظور ہے کہ قاضی قطر بھی ایصال ثواب کے

قائل ہیں، خط کشیدہ عبارت پڑھ لیں۔ امت میں ایک فرد بھی قابل ذکر ایسا نہ ملے گا جو ’’عبدالخالق صاحب‘‘ کا ہمنوا ہو، اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ایصال ثواب باطل۔

مؤلف کا دوسرا تنقیدی بیان:

مفتی جمیل احمد صاحب نے ایصال ثواب کے ثبوت میں حج بدل کی متعدد روایتوں سے استدلال کیا ہے۔ ان حدیثوں میں تین طرح کے مضمون وارد ہیں:

(۱) والدین میں کوئی بہت ضعیف ہے، حج کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس کی اولاد نے اس کی جانب سے حج کی اجازت چاہی، اور آپ نے اجازت دی۔

(۲) والدین میں سے کوئی مر گیا، اور اس نے حج کی نذر مان رکھی تھی، اس کی نذر پوری کرنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا، اور آپ نے اجازت دی۔

(۳) بغیر نذر کے ذکر کے کسی کی جانب سے حج کی اجازت چاہی گئی۔

نمبر (۱) کے سلسلے میں مؤلف نے وہی بات دہرائی ہے، جس کو ہم تفصیل کے ساتھ رد کر چکے ہیں، یعنی زندہ اور مردہ کی لایعنی بحث۔ البتہ نمبر (۲، اور ۳) کے سلسلے میں ان کا اصرار ہے کہ دونوں میں نذر معین ہی کے متعلق مسئلہ دریافت کیا گیا ہے۔ ہمیں اس کے مان لینے میں کوئی تأمل نہیں، گو تحقیق کچھ ہو، مگر یہاں ہم مؤلف کی بات تسلیم کرتے ہیں۔ اب سنئے نذر کے سلسلے میں مؤلف کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ ارشادات منتشر ہیں۔ مگر ہم ایک جگہ سہولت کے لیے لکھے دیتے ہیں۔ موصوف کے مطلب کی ادائیگی میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ لکھتے ہیں:

> ’’(نذر) کا تعلق ایصال ثواب اور حج بدل سے کسی طرح نہیں جوڑا جا سکتا۔ (ص: ۹۲) اگر والدین بغیر حج یا نماز فرض کی ادائیگی کے مر گئے، تو اولاد پر اس کی ادائیگی واجب نہیں، البتہ نذر کا حکم یہ ہے کہ اس کی ادائیگی اولاد پر لازم ہے۔ اس لیے کہ نذر کی حیثیت قرض جیسی ہوتی ہے۔ (ص: ۹۳) ہمارے علم میں تو نذر کا مسئلہ یہی ہے کہ اگر نذر کنندہ بلا تکمیلِ نذر فوت ہو گیا تو اس کے ورثہ پر اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔‘‘ (ص: ۹۴)

اس تنقید پر ہمارا سوال یہ ہے کہ نذر کا تعلق ایصال ثواب اور حج بدل سے کیوں نہیں جوڑا جا سکتا؟ صرف اس لیے کہ آپ نے کہہ دیا ہے اور آپ کے علم میں کہاں سے یہ مسئلہ آیا کہ نذر کنندہ بلا تکمیلِ نذر مر گیا تو اس کے ورثہ پر اس کی ادائیگی ضروری ہے؟ شاید احادیث میں قرض والی مثال سے آپ نے سمجھا ہو۔ لیکن یہ آپ کی سمجھ کا قصور ہے۔ احناف کے نزدیک اگر نذر کنندہ بلا تکمیلِ نذر فوت ہوا ہے اور وصیت کر گیا ہے، تب تو ضروری ہے، ورنہ نہیں۔ اور بعینہٖ یہی مسئلہ حج بدل کا ہے۔ دو بات آپ کو معلوم ہوئی اور دونوں غلط۔ اور سن لیجئے، حدیث کو اپنی تھوڑی سی فہم کے بل بوتے پر حل کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ آپ کے متعلق خوب تجربہ ہو چکا ہے۔ اس اعتراض کا حشر تو آپ دیکھ چکے، اب آگے ملاحظہ فرمائیے:

مؤلف کا تیسرا تنقیدی پیراگراف: اس پیراگراف میں مؤلف موصوف نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو موضوع بحث بنایا ہے، اور ایسی الجھی ہوئی بحث فرمائی کہ نہ دعویٰ کا پتہ، نہ دلیل کی خبر، جو چاہا جھاڑ دیا۔ مؤلف کی یہ بحث ان کے انتشارِ دماغی کی مکمل آئینہ دار ہے۔ پوری بحث غور سے پڑھنے کے باوجود آپ نہیں سمجھ سکتے کہ مؤلف نے کیا کہنا چاہا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ پہلے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ مفتی جمیل احمد صاحب کی عبارت کا ادھورا اور نامکمل اقتباس مؤلف نے پیش کیا ہے۔ لہٰذا ہم اس سے قطع نظر کر کے پوری بحث ہی ناظرین کی سہولت کے لیے لکھے دیتے ہیں:

یہ روایت تین صحابہ سے مروی ہے۔ (۱) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔

امام نسائی نے یہ روایت براہِ راست حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، اس میں ہے کہ:

> حضرت سعد بن عبادہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میری ماں کی وفات ہوگئی، کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کرسکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، میں نے عرض کیا کہ کون سا صدقہ بہتر ہوگا؟ فرمایا کہ پانی کا، یعنی کنواں۔ (نسائی بحوالہ فتح الباری، ج: ۵، ص: ۳۸۹)

امام بخاری نے حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عباس دونوں حضرات سے روایت نقل کی ہے:

> حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میری ماں کا یکبارگی انتقال ہوگیا، میرا خیال ہے کہ اگر کچھ کہنے کا موقع پاتیں تو صدقہ کرتیں، کیا میں ان کی جانب سے صدقہ کردوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تم صدقہ کردو۔ (بخاری، کتاب الوصایا)

ابوداؤد میں یہی سوال وجواب ایک عورت کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا تھا، اور ان کی بہن نے بھی، حضرت سعد کا گھرانا کافی مال دار تھا، اور ماں کا انتقال ہوگیا، اس لیے سارے گھر پر اس کا اثر تھا، ہر ایک چاہتا تھا کہ ماں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانا چاہئے۔ اسی لیے بھائی، بہن نے الگ الگ سوال کیا، اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں، مگر عجب نہیں کہ مؤلف صرف اس بنیاد پر کہ ایک روایت میں پوچھنے والا مرد ہے، دوسری میں عورت ہے، روایت کی تکذیب پر تُل جائیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مفصل بھی اور مختصر بھی صحاح میں موجود ہے۔ بخاری میں بھی، مسلم میں بھی، ترمذی اور ابوداؤد میں بھی، بعض میں نذر کا ذکر ہے، اور بعض میں نہیں، جس میں نذر کا ذکر نہیں، اسے ترمذی شریف کے حوالے سے ہم حدیث نمبر (۴) کے ذیل میں لکھ آئے ہیں۔ نذر والی روایت بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

> حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن

عبادہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میری ماں مرگئی ہیں، اور ان پر ایک نذر ہے، فرمایا: تم ان کی جانب سے ادا کردو۔ (بخاری کتاب الوصایا)

ایک بار ان روایات کو پھر پڑھ لیجئے، ان میں دو طرح کے سوال مروی ہیں، ایک یہ کہ وارث، ماں کی طرف سے صدقہ کرنا چاہتا ہے۔ سوال ہے کہ اس سے ماں کو فائدہ ہوگا؟ دوسرے یہ کہ ماں کے ذمے نذر ہے۔ اسے ادا کرنے کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

غالباً مفتی جمیل احمد نذیری نے دونوں کو الگ الگ سوال قرار دیا ہے، مگر مؤلف کو اصرار ہے کہ یہ ایک ہی سوال ہے۔ بس تعبیر الگ الگ ہے۔ اور سوال ایک ہونے کی دلیل ایسی عجیب وغریب ہے کہ اسے دلیل صرف مؤلف ہی قرار دے سکتے ہیں۔ انھیں کی زبان فیض ترجمان سے سنئے، فرماتے ہیں:

> ”اگر حضرت سعد بن عبادہ نے اپنی ماں کی طرف سے باغ یا کنواں صدقہ کیا تھا تو یہ غیر ممکن ہے۔ میں ثابت کرتا چلا آرہا ہوں کہ ایصال ثواب نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ سنت رسول سے، اور نہ ہی خلفائے راشدین وازواج مطہرات اور صحابہ کرام کے اجماعی عمل سے .... پھر حضرت سعد بن عبادہ کی کیا خصوصیت تھی کہ حضور ﷺ ایصال ثواب کی خصوصی اجازت مرحمت فرماتے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ عام مسلمانوں سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ. (کیا غضب ہے کہ دوسروں کو تو نیک کام کرنے کو کہتے ہو، اور اپنی خبر نہیں لیتے، حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی۔“
>
> (ص:۹۹)

یہاں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ عقل وخرد، دعویٰ ودلیل اور علم وحکمت سب کو آواز دوں کہ آؤ! دیکھو کس بے دردی کے ساتھ یہ شخص تمہاری مٹی پلید کررہا ہے، اور اسے بچوں کا کھیل سمجھ رہا ہے۔

مؤلف محترم! کچھ پڑھ لکھ لیے ہوتے تو قلم پکڑتے، آپ کہتے ہیں کہ میں ثابت

کرتا چلا آرہا ہوں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا ثابت بھی ہوگیا؟ آپ ایصال ثواب کی دلیلوں کو توڑنے بیٹھے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ دلیل کو دلیل سے توڑیں۔ آپ تو دلیل کے جواب میں دعویٰ ہی دہرا رہے ہیں۔ یہ انداز تو آپ کی دماغی حالت کو انتہائی مشتبہ قرار دے رہا ہے۔ اگر یہی بات تھی تو آپ نے کتاب لکھنے کی زحمت کیوں برداشت فرمائی؟ اعلان کرا دیتے کہ صاحبو! میں ایصال ثواب کو باطل کر چکا ہوں، لہذا جس روایت میں ایصال ثواب کا ثبوت نظر آئے، اسے غیر ممکن تصور کرنا۔ غضب ہے! مفتی ایک روایت پیش کرتا ہے، اس میں ایصال ثواب کا صراحۃً ذکر ہے، لیکن مؤلف اسے ماننے سے اس لیے انکار کر دیتا ہے کہ وہ اپنی دانست میں ایصال ثواب کو باطل کر چکا ہے۔

بھولے مؤلف! کوئی دعویٰ اس وقت رد ہوتا ہے جب اس کی تمام دلیلیں ٹوٹ جائیں۔ اگر ایک دلیل بھی ٹوٹنے سے رہ جائے تو دعویٰ اسی آب وتاب سے زندہ رہے گا۔ ایصال ثواب کی تمام دلیلیں آپ کی دانست میں ٹوٹ چکی تھیں، ایک حضرت سعد بن عبادہ کی روایت رہ گئی تھی، اسے بھی توڑتے۔ بیشک آپ نے توڑا، لیکن کس طور پر؟ آپ فرماتے ہیں کہ میں ایصال ثواب کو باطل کرتا چلا آرہا ہوں، لہذا یہ دلیل آپ سے آپ موت کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ یہ ہے آپ کی عقل سلیم کا حال!

مؤلف کی فهم اور بینائی: پھر اس پر یہ ارشاد بھی عجیب ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کو حضور ﷺ ایصال ثواب کی اجازت مرحمت فرماتے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ عام مسلمانوں سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: أَتَـأْمُـرُوْنَ النَّـاسَ بِـالْبِـرِّ وَتَـنْسَـوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ. مطلب یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نے ایصال ثواب نہیں کیا، اور فلاں فلاں نے نہیں کیا تو اگر سعد بن عبادہ کو ایصال ثواب کی اجازت دیں گے، تو اس آیت کا مصداق بننا لازم آئے گا، اور یہ آیت حضور ﷺ پر چسپاں ہو جائے گی، حالانکہ ایسا ناممکن ہے۔ پھر اس مطلب پر مؤلف نے ایک بلیغ تقریر بھی جھاڑی ہے۔

ہم مؤلف کو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ ہم تو اس کتاب کے احتساب کا ارادہ کر کے

حیران ہو گئے۔ ایصال ثواب ابھی باطل ہی کہاں ہوا کہ حضرت سعد کی خصوصیات کا سوال پیدا ہوتا۔ دوسرے بھلا مصنف سے کوئی پوچھے کہ آپ کبھی قرآن بھی پڑھتے ہیں؟ جو آیت آپ نے نقل کی ہے، وہ پہلے ہی پارے میں ہے۔ ذرا قرآن کھول کر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ عام مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں یا یہود سے؟ قرآن کا بالکل ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ خطاب یہود سے ہے۔[1] چنانچہ سلسلۂ کلام کی ابتداء یَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اذْکُرُوْا (اے بنی اسرائیل! یاد کرو) سے ہوئی ہے۔ لیکن مؤلف نے تو سیاق وسباق سے آنکھ بند کر رکھی ہے۔ اس پر بھی ارشاد ہے:

> ’’اجتہادی مسائل میں امام ابوحنیفہ کا آنکھوں والا مقلد ہوں اور جماعتی حیثیت سے ایک بینا دیوبندی‘‘ (ص:۱۱)

ایسی ہی آنکھ ہے اور ایسی ہی بینائی ہے کہ جہاں سے آیت لی، وہیں کی ابتدائی آیات نظر نہیں آئیں، سیاق وسباق نظر نہیں آیا۔ ایسی بینائی تو آج تک دیکھی نہ سنی۔

بحث کا دوسرا رخ: ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ یہ ایک واقعہ ہے یا دو، ہمارے نزدیک اصل مسئلہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم مؤلف کی بات تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں سوال نذر ہی سے متعلق تھا، لیکن کیا اس سے ایصال ثواب کا مسئلہ ختم ہو گیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں ختم ہو گا۔ تفصیل پڑھئے:

مؤلف نے کہیں لکھا کہ نذر کنندہ اگر نذر کی تکمیل سے پہلے مر جائے، تو وارثوں پر اس کی تکمیل ضروری ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مؤلف سے غلطی ہوئی، مسئلہ یہ ہے کہ نذر کنندہ اگر تکمیل نذر کی وصیت کر کے مرا ہے، اور ترکہ بھی اتنا چھوڑا ہے کہ تہائی مال سے اس کی ادائیگی ہو جائے گی، تب وارثوں پر تکمیل وصیت واجب ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ نذر بسلسلۂ مال

---

[1] لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اگر امر بالمعروف کریں اور اپنے آپ کو فراموش کر جائیں تو درست ہے، خطاب تو یہود سے ہے۔ لیکن اس صفت کی مذمت عام ہے۔ مسلمانوں کے ذمے بھی ضروری ہے کہ اس سے احتراز کریں۔ اور کلام میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ روئے سخن کسی خاص کی طرف ہوتا ہے اور گفتگو عام ہوتی ہے۔

ہو، ورنہ عبادت بدنی کی نذر باوجود وصیت کے بھی پوری نہیں کی جاسکتی، بجز حج کے۔ بہر حال وصیت شرط ہے، بغیر وصیت کے نذر کی تکمیل واجب نہ ہوگی۔ حضرت سعد بن عبادہ کا واقعہ پڑھئے، اس میں صراحتہً یہ بات موجود ہے کہ ماں وصیت نہیں کر سکی تھیں۔ اسی بناء پر سوال پیدا ہوا، اب کیا کیا جائے؟ ماں کی نذر پوری کی جائے تو ان کا ذمہ اترے گا یا نہیں؟ اگر وصیت کر گئی ہوتیں تو یہ سوال ہی نہ اٹھتا۔ اور وصیت کی صورت میں تکمیل وصیت مورث کے مال سے ہوتی ہے۔ وصیت نہیں ہوئی تو مال سب کا سب وارث کی ملکیت میں منتقل ہو گیا۔ اب وارث اپنے مال سے نذر پوری کرنا چاہے، تو کیا مرنے والے کو اس سے فائدہ ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا کہ نذر پوری کردو، میت کو فائدہ حاصل ہوگا۔

اب ناظرین بتائیں کہ اپنے مال سے حضرت سعد کنواں کھدوائیں یا باغ صدقہ کریں، بہر حال مال ان کی ملکیت کا ہے۔ ثواب کا استحقاق ان ہی کو ہے۔ یہی ثواب منتقل ہوکر ماں کو بھی فائدہ پہنچا رہا ہے۔ کس درجہ واضح دلیل ہے! مگر مؤلف نے نہ جانے کیا سے کیا سمجھ لیا۔ بے چارہ مبادی سے بھی واقف نہیں، اور دلائل کے میدان میں کود پڑا۔ پھر جو حشر ہے سامنے ہے۔

غیر متعلق بحثیں: حضرت سعد بن عبادہ کی روایت کے متعلق اصل بحث تو مکمل ہوگئی، لیکن مؤلف نے عادت کے مطابق کچھ غیر متعلق بحثیں بھی چھیڑ دی ہیں۔ ان کا بھی محاسبہ ہوجائے تو بہتر ہے۔

سب سے پہلے یہ بحث اٹھائی ہے کہ وہ کنواں تھا کہ باغ؟ ارشاد ہے کہ:

> ”امام بخاری وامام ترمذی نے باغ لکھا ہے، اور امام ابوداؤد وامام نسائی نے کنواں لکھا ہے۔ دیکھئے مشکوۃ ج:ا، ص:۱۱۴۔“ (ص:۹۹)

اس جگہ دو باتیں ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئیں، ایک تو یہ کہ مشکوۃ شریف کا حوالہ کس بات کے سلسلے میں دیا ہے؟ اگر پوری عبارت کے لیے دیا ہے تو غلط ہے۔ کیوں کہ مشکوۃ شریف میں نہ کنویں کا ذکر ہے اور نہ باغ کا۔ دوسری بات یہ نہیں سمجھ میں آئی کہ کس

مشکوۃ شریف کا حوالہ دیا ہے؟ شاید اردو مشکوۃ شریف کا حوالہ دیا ہو، وہ ہمارے پاس نہیں ہے، اور اگر عربی کا حوالہ ہے تو صفحہ غلط ہے۔ حدیث کی کتابوں میں باب کا حوالہ دینا چاہئے، صفحہ نمبر سے بات نہیں بنتی، کیوں کہ مختلف مطابع سے کتابیں چھپی ہیں، اگر مطبع کا بھی حوالہ دے دیں تو کیا ضروری ہے کہ اسی مطبع کی دوسرے کے پاس ہو۔ ہمیشہ باب کا حوالہ دینا چاہئے۔ بخاری و ترمذی میں بے شک باب کا ذکر ہے، لیکن ابوداؤد میں باوجود تلاش کے ہمیں کنویں کا ذکر نہ مل سکا، باغ کا ذکر البتہ اس میں بھی ہے۔ نسائی شریف اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے، ہم نے فتح الباری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس میں کنویں کا ذکر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ باغ ہو یا کنواں، اس سے اصل مسئلے پر کیا اثر پڑتا ہے کہ اس کی بحث لے بیٹھے۔ پھر باغ اور کنویں کے سلسلے میں صفحہ ۱۰۵ پر جو گل افشانیاں فرمائی ہیں، وہ بس ان ہی کا حصہ ہیں۔ یرقان زدہ کو تمام چیزیں پیلی نظر آتی ہیں، تاریک شیشوں کی عینک لگا لو اور شور مچا دو کہ سورج کی روشنی بھی سیاہ ہے۔ ہم اس کتاب کے چوتھے باب میں نقل کر دیں گے، پڑھ لیجئے گا۔

حضرت ام سعد کی نذر کیا تھی؟

مؤلف بڑی حیرت سے لکھ رہے ہیں کہ:

> ”دوسرے یہ کتنے تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے محدثین کو آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حضرت سعد بن عبادہ کی ماں نے کس بات کی نذر مانی، کنواں تھا کہ باغ، غلام آزاد کرنے کی یا روزے کی، صدقہ و مال کی یا نذر مبہم تھی، جس کی کوئی نہ تو وضاحت ہو سکی اور نہ اتفاق۔“ (ص:۱۰۲)

ہمیں تعجب ہے کہ مؤلف کو اس پر تعجب کیوں ہوا! کیا نذر کی تعیین نہ ہو سکنے کی وجہ سے روایت مخدوش ہو گئی؟ میرے بھولے دوست! یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، روایات میں نذر کی تعیین ہے ہی نہیں، محدثین نے قرائن سے تعیین کرنے کی کوشش کی ہے، یہ تو ان حضرات کے علم حدیث کے ساتھ انتہائی شغف اور والہانہ شوق کی دلیل ہے کہ حدیث میں

حضرت ام سعد کی نذر کا ذکر آ گیا، تو بے چین ہو گئے، کہ کسی ذریعہ سے اس نذر کی تعیین ہو جائے، شاید اس سے حدیث کے سمجھنے میں مزید سہولت پیدا ہو، یہ تو ان کے ہنر کی بات تھی، جسے آپ نے عیب سمجھ لیا۔

نذر کی شرعی حیثیت: مؤلف نے نذر کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات لکھی ہے، لکھتے ہیں:

> ”اب رہا نذر کا ماننا، تو یہ نہ فرض ہے اور نہ سنت، نہ واجب ہے نہ مستحب، بلکہ حضور ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا ہے:
>
> تم نذر نہ مانو، اس لیے کہ نذر تقدیر کو دور نہیں کر سکتی، اور نذر سے بخیل سے مال نکالا جاتا ہے۔ (متفق علیہ)
>
> ملاحظہ ہو کہ حضور اکرم ﷺ نے کتنے واضح اور صاف طریقے سے نذر ماننے کی ممانعت فرما دی اور اس کی بھی وضاحت کر دی کہ نذر سے تقدیریں نہیں بدل سکتیں، ہاں نذر کے ذریعہ کنجوس اور بخیل کا مال باہر آ سکتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود حضور اکرم ﷺ کے حضرت سعد کی ماں نے نذر کیوں مانی تھی؟ (ص:۱۰۳)

ہم مصنف کی ذہنی مفلسی کا ماتم کریں، یہاں انھوں نے فتویٰ دے دیا کہ نذر کا ماننا ناجائز ہے۔ چلو چھٹی ہوئی، ایک ناجائز کام سے استدلال ہی کہاں جائز ہے؟ پھر نہ جانے تمام محدثین اور فقہاء نے اس کی تفصیلات میں کیوں صفحات سیاہ کئے ہیں؟ یہی لکھ دیتے کہ ناجائز ہے؛ کیوں کہ چودہ سو سال کے بعد ایک شخص مبارکپور میں ہینڈلوم چلاتا ہوا یہی فتویٰ دے گا، اور اس کا فتویٰ اگلے اور پچھلے زمانوں کو محیط ہوگا۔ بھلے آدمی! اگر نذر ماننی ناجائز تھی تو رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں کیوں نہیں یہ سوال پیدا ہوا؟ آپ تو صاحب شرع تھے، آپ کو فوراً فرمانا چاہئے تھا کہ میاں سعد! یہ کیا پوچھ رہے ہو؟ تمہاری ماں نے غلط کام کیا، پھر غضب تو ہے کہ آپ نے صرف یہی نہیں کہ اعتراض نہیں کیا، بلکہ الٹا یہ فرماتے ہیں کہ جاؤ، اس کی قضا کرو۔ کیا ناجائز کام کی بھی قضا ہوتی ہے؟

نذر کی ممانعت والی حدیث، آنکھوں والے مؤلف نے مشکوۃ سے لی ہے، وہیں تھوڑا سا اور پڑھ لئے ہوتے تو نذر کے جواز کی تمام حدیثیں موجود ہیں۔ ہمیں تو ایسے مسئلے پر حدیث نقل کرتے ہوئے شرم آتی ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ نذر ناجائز ہے۔

مسلمانو! ابھی تو ایصال ثواب ہی کے عدمِ جواز پر کتاب تالیف کی گئی ہے، آگے نذر کے عدمِ جواز کے لیے بھی تحقیق انیق آئے گی۔ میاں صاحب! جب حدیث سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی تو کیوں اس میدان میں کود پڑے؟

مذکورہ بالا حدیث نذر کے عدم جواز کو نہیں بتاتی، اس کا مقصود صرف اتنا ہے کہ نذر سے تقدیر نہیں بدل سکتی۔ پھر کیا ضرورت ہے اس کی؟ یہ ایک ایسا کام ہے کہ اس سے کوئی کام بنتا بگڑتا نہیں، ہاں نذر کی تکمیل میں بخیل کا کچھ مال خرچ ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد بطور مشورہ کے ہے، بطور تشریع کے نہیں ہے۔ مؤلف نے ایک جگہ ایصال ثواب ماننے کو للکارا ہے کہ:

> ”مگر زید نے نہ نذر کو جانا، نہ وصیت سے واسطہ رکھا، نہ نیابت کو سمجھا، نہ سنت کیا ہے؟ اس پر غور کیا۔ ایصال ثواب کے ثبوت میں سب کو گڈ مڈ کیا، واقعات کو توڑا، مروڑا، حدیث میں کھینچا تانی کی، حضور ﷺ کے ہر فعل کو سنت کا درجہ دینے لگا، اسے پتہ ہی نہیں چل سکا کہ حضور ﷺ کی خصوصی حیثیت کیا ہے؟“ (ص: ۲۸)

ہم اس بات کو معمولی سی ترمیم کے ساتھ مؤلف کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

> مؤلف نے نہ نذر کو جانا، نہ وصیت سے واسطہ رکھا، نہ نیابت کو سمجھا، اور نہ تشریع کیا ہے؟ اس پر غور کیا۔ ایصال ثواب کے ابطال میں سب کو گڈ مڈ کیا، واقعات کو توڑا، مروڑا، حدیث میں کھینچا تانی کی، حضور ﷺ کے ہر قول کو تشریع کا درجہ دینے لگا، اسے پتہ ہی نہ چل سکا کہ حضور ﷺ کی خصوصی حیثیت اور کیا کیا ہے؟

کیا تکمیل نذر سے ثواب نہیں ہوتا؟: مؤلف نے پھر ایک انوکھا دعویٰ کیا، بالکل نیا اور اچھوتا، لکھتے ہیں:

> ''اگر بالفرض (ام سعد نذر) مان بھی لیں تو اس کے ماننے سے انھیں نذر پر ثواب کہاں سے برس پڑتا؟ اس لیے کہ نذر ماننے والا تو اللہ تعالیٰ سے ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے، جو دونوں کے مابین مشترکہ لین دین کا ہوتا ہے۔ ماننے والا کہتا ہے کہ اے اللہ! تو میرا فلاں کام میری مرضی کے مطابق پورا کردے، تو میں یہ یہ کروں گا۔ اب اگر وہ اس کی مرضی ومنشا کے مطابق پورا ہوگیا تو اس نے بطور اشتراک بدل وہ شرط پوری کردی، چلو برابر ہوگیا کہ نذر مشروط تھی، اب مزید ثواب مدفاضل میں کیوں اور کیسے حاصل ہوا؟ اور اگر خدا کی مرضی نہ ہوئی تو نذر ماننے والے نے وہ کچھ نہ کیا جس کا عہد کرچکا ہے۔'' (ص:۱۰۳)

اس پر ہمارا تبصرہ فقط اتنا ہے کہ نذر میں مثلاً حج کو مانا تھا، پھر وہ نذر پوری کرنے کے لیے حج کرتا ہے تو بقول مؤلف ''حج کا ثواب اسے نہ ملے گا'' یہ بات بے دلیل ہے۔ مؤلف کے ذمہ ہے کہ کوئی دلیل پیش کریں۔

اچھا فرض کیجئے کہ کسی نے بغیر کسی شرط کے نذر مانی، مثلاً کسی بات پر اسے بہت مسرت ہوئی، خوش ہوکر بطور شکرانہ کچھ وہ نذر مانتا ہے کہ میں حج بیت اللہ کروں گا۔ یہاں تو کچھ لین دین کا معاملہ بھی نہیں ہوا۔ کیا اس کو نذر نہ کہیں گے؟ یا اس پر بھی ثواب نہ ملے گا؟ اب پھر ہم مؤلف ہی کا ایک جملہ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ دہرائیں گے:

> ''محترم مؤلف صاحب! نذر کے مسئلے پر اتنی وضاحت ہوچکی ہے کہ اب آپ کو اپنی بات کی قدر وقیمت پر غور فرمانا چاہئے۔ مؤلف صاحب! بے سروپا اور بے وزن باتوں سے آدمی ہلکا ہوجاتا ہے۔'' (ص:۱۰۳)

مصنف کی ذہانت کے دو اور نمونے: ایک جگہ موصوف لکھتے ہیں:

> ''یہ بات تو ناقابل فہم ہے کہ اگر ایصال ثواب صرف جائز اور مباح ہے تو پھر یہ متفقہ عقیدہ کیسے ہوا؟ اور اگر ایصال ثواب علماء کرام کا متفقہ عقیدہ ہے تو آپ اسے جائز ومباح ہی کیوں بتا رہے ہیں؟'' (ص:۱۴۲)

پھر مؤلف ہی بتائیں کہ ایصال ثواب کو کیا بتایا جائے؟ فرض وواجب کہا جائے؟

عجیب بات ہے کہ اگر کوئی عمل مباح ہو اور اس کا عقیدہ رکھا جائے تو کیا ضروری ہے کہ اسے واجب بتایا جائے؟ مؤلف کو اتنی بھی سمجھ نہیں ہے کہ ایصال ثواب کے مباح ہونے کا متفقہ عقیدہ ہے۔ موصوف نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو چیز عقیدہ سے جوڑی جائے، لازماً اسے فرض، واجب یا سنت ہونا چاہئے۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ عقیدہ کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے۔ شرک کے حرام ہونے کا عقیدہ ہے، نماز کے فرض ہونے کا عقیدہ ہے، حلال جانوروں کے گوشت کھانے کی اباحت کا عقیدہ ہے، تو کیا آپ مطالبہ کریں گے: گوشت کھانے کو واجب کہو، یا یہ کہیں گے کہ اس کی اباحت کا عقیدہ مت رکھو۔

پھر لکھتے ہیں:

> ’’اب رہا یہ مسئلہ کہ کیا جو چیز صرف جائز و مباح ہے، اس پر ثواب بھی ملتا ہے؟ اس کی بھی دلیل کی ضرورت ہے۔ اور اگر ثواب نہیں ملتا ہے تو یہی بتائیں کہ ایصال ثواب مردے کی قربانی اور مردے کے حج بدل سے کیا حاصل ہوا؟‘‘ (ص:۱۴۳)

کتنی موٹی سمجھ ہے جناب عالی کی! کس مسخرے نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ’’ایصال ثواب کا ثواب‘‘ مُر دے کو پہنچتا ہے؟ مردے کو تو قربانی کا ثواب پہنچتا ہے، حج بدل کا ثواب پہنچتا ہے، تلاوتِ قرآن کا ثواب پہنچتا ہے، صدقہ کا ثواب پہنچتا ہے۔ ’’ایصالِ ثواب‘‘ کے ثواب کا کس نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ خواہ مخواہ قلم چلا رہے ہیں؟ کیا مذکورہ عبادات کارِ ثواب نہیں ہیں؟ یا ایصال ثواب کی نیت کرنے سے ان کی عبادتی حیثیت ختم ہوگئی؟۔

جنابِ من! آپ نے کتاب لکھی تھی، تو کسی صاحب عقل آدمی کو دیکھا لئے ہوتے، وہ ایسی حماقتیں کتاب سے خارج کر دیتا اور کتاب پر اعتراض کم سے کم ہوتا۔ لیکن آپ نے تو فرض کرلیا ہے کہ چودہ سو سال سے آج تک ساری دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی قابل اور عالم، وجود ہی میں نہیں آیا۔ غرورِ علم کی ترنگ میں قلابازیاں کھاتے چلے گئے۔

❖◆◆❖

بسم اللہ الرحمن الرحیم

□ باب چہارم

طغیان

کتاب پر ہمارا تبصرہ مکمل ہو چکا۔ یہ تبصرہ کتاب کے ١٠٦ر صفحات تک کے مضامین پر ہے۔ مؤلف نے اس کے بعد ایک عنوان ''کیا حضور اکرم ﷺ نے اپنا ثواب کسی کے حوالے کیا؟'' کے تحت مفتی جمیل احمد نذیری کے فتوی کے کچھ اور اجزاء پر تنقید کی ہے، آگے چل کر کچھ اور بھی عنوانات ہیں، اس حصے میں بھی مؤلف نے وہی دماغی کمالات دکھائے ہیں، جن کے نمونے ہم پیش کر آئے ہیں، لیکن ہم اس حصے کو دو وجہ سے نظر انداز کرتے ہیں:

(١) ایک تو اس لیے کہ اصل مسئلے پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے، مؤلف انھیں چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کر رہے ہیں۔ سابقہ احتساب کافی ہے۔

(٢) دوسرے یہ کہ مؤلف کے اقتباسات کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو ایصال ثواب کے حق میں جو دلائل مفتی صاحب نے یہاں پیش کئے ہیں، ہمارے نزدیک وہ ایصال ثواب کے دلائل نہیں ہیں، ایک غیر متعلق بحث ہے۔

نامعقول جسارت: البتہ مؤلف نے متعدد جگہوں پر صحیح احادیث کے ساتھ تمسخر محض اس لیے کیا ہے کہ ان کی مختصر سی عقل میں ان کا مطلب نہ آسکا۔ انھوں نے اپنی عقل و خرد کی کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے صحیح روایات کی تغلیط شروع کر دی، تغلیط ہی نہیں انتہائی غیر شریفانہ استہزاء اور ٹھٹھا۔ عقل شریف کا تو حال ظاہر ہو چکا ہے، اسی کے بل بوتے پر سارے محدثین و فقہاء، ائمہ کی تحمیق و تجہیل کی نجاست اپنے چہرہ پر لیپ لی ہے، مؤلف کی اس غیر شریفانہ روش کے چند نمونے ہم عام مسلمانوں کی عبرت کے لیے پیش کر چکے ہیں،

تا کہ اس بات پر بخوبی غور کر لیں کہ ایسا شخص خدا ترس، قابل اعتماد اور سنجیدہ و مہذب کہلانے کا مستحق ہے کہ کھلنڈرا، دشمنِ عقل وفہم اور غیر سنجیدہ و بے تہذیب کہے جانے کا؟

صحیح روایات کی تذلیل: حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، ان کی ماں کے نذر کے سلسلے میں روایات آپ پڑھ چکے ہیں، ان روایات پر مؤلف اپنی عقل شریف سے تبصرہ فرماتے ہیں، پڑھ لیجئے، اور مؤلف کا جغرافیۂ تہذیب و ادب دیکھ لیجئے:

> ’’اگر ان تمام روایتوں پر درایت سے کام لیا جائے تو ان کی شکل بالکل ان سرکاری کاغذات کی طرح ہو جائے گی، جن میں مقامی کارکنان نے ان گنت اسکول، پل، کارخانے اور عمارات تعمیر درج کی ہیں، مگر جب موقع پر دیکھا جائے تو وہاں خاک اڑتی نظر آتی ہے، سرکاری خزانوں سے ان مدات میں رقموں پر رقمیں خرچ ہو رہی ہیں، مگر نہ کہیں اسکول کی تعمیر ہوئی نہ پل بنا، نہ کہیں سوسائٹیاں ہیں اور نہ کارخانوں کا وجود، مگر کاغذات پُر از کار ہیں۔
>
> یہی حال آپ کے اس روایتی حضرت سعد کے کنویں یا باغ کا بھی ہے کہ نہ تو یہ معلوم ہو سکا کہ انھوں نے کنواں کب اور کہاں کھدوایا، نہ کسی نے اسے دیکھا، اور نہ ایک چلو پانی پی کر پیاس بجھائی، نہ ان کے باغ کے سائے میں دم لیا، نہ کسی کو اس کا پھل نصیب ہوا، نہ کبھی اس کی لکڑیاں ہی استعمال میں آئیں۔ بس کتابوں میں باغ یا کنویں کی تمثیلی حکایت آ گئی اور آپ کو ایصال ثواب ثابت کرنے کی ایک کلید مل گئی۔ اور تاریخ اور روایات و راوی اس ضمن میں بھی خاموش رہے کہ حضرت سعد نے جو باغ صدقہ کیا، اس کی حیثیت کیا تھی؟ کیا اس کا پھل فروخت کر کے غرباء و مساکین کی مدد کی جاتی تھی؟ یا اس کی لکڑیاں کاٹ کر غرباء و مساکین کے حوالہ کی جاتی تھیں؟ آخر کیا تھا کہ اعلان ہو گیا کہ میرا یہ باغ ہر امیر و غریب کے لیے ہے، جس کو جیسی ضرورت ہو پوری کر لے۔‘‘

آپ سمجھے مؤلف کو اس روایت سے کیوں انحراف و انکار ہے؟ اس لیے کہ یہ تفصیلات مؤلف کے علم میں نہیں، اور جب مؤلف جیسا ہمہ داں انھیں نہیں جانتا تو لازم آیا

کہ سرے سے کنویں اور باغ کا وجود نہیں ہے۔ اگر یہی طرزِ استدلال ہے تو قرآن کے بیان کردہ واقعات کی بھی خبر لیجئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت سعد بن عبادہ کی تحقیر: صحابی رسول حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے متعلق مؤلف کی بدگوئی ملاحظہ ہو:

> ”مفتی صاحب! آپ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ حضرت سعد کون تھے؟ غزوۂ تبوک اور واقعۂ افک میں ان کا نام کس طرح آیا ہے؟ سقیفہ بنو ساعدہ میں جب کہ ان کے ہاتھ پر بیعت خلافت ہوتے ہوتے یک بیک حضرت ابوبکر صدیق کے دست مبارک پر بیعت ہونے لگی اور ہوئی تو وہ کہاں گئے؟ اور کیا ہوئے؟ کیا آپ بتاسکیں گے کہ وہ انتقال کر گئے یا قتل ہوئے، یا ان کی قبر کہاں ہے؟ کوشش کیجئے اور اغلباً جس طرح آپ ان کے کنویں کی جستجو میں نامراد رہے، اس میں بھی کنویں کے مینڈک بن کر رہ جائیں گے۔“

تہذیب وشرافت ملاحظہ کرلی آپ نے؟

ائمہ حدیث کی شان میں گستاخی: مؤلف نے ص: ۱۸، ۱۹ پر تین حدیثیں ایک مضمون کی نقل کی ہیں، حدیث کا مطلب سمجھنے کا سلیقہ تو ہے نہیں، آپ کی تنگ وتاریک عقل میں اس کا مفہوم نہ آسکا تو ایک طومار لے بیٹھے۔ ناظرین ان حدیثوں کے متعلق مؤلف کی ہرزہ سرائی کی وجہ سے کسی وسوسہ میں مبتلا نہ ہوں گے۔ اگر کچھ الجھن ہو تو کسی معتبر عالم سے دریافت کرلیں۔ یہاں تو مؤلف کی طراری دیکھئے:

> ”اسلام ایک سیدھا، سادہ عقلی وفطری مذہب تھا، مگر اسی کو ماننے والے کچھ محدثوں، اماموں، مفسروں، مفتیوں اور مولویوں نے اسے اس قدر ٹیڑھا میڑھا، غیر عقلی اور غیر فطری بنادیا ہے کہ بسا اوقات عقل (۱) حیران رہتی ہے اور ان کے عقل وشعور کا ماتم کرنا پڑتا ہے۔ آپ بھی اس سیدھے اور عقلی مذہب کے خلاف ایک حدیث سنئے، جو امام مسلم نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ (پھر مسلم شریف سے تین حدیثیں نقل کرکے آگے تبصرہ کرتے ہیں)
>
> مبارک ہواے مومنین صالح (۲) اور ناعاقبت اندیش کہ ان تینوں احادیث نے نہ

---

(۱) اور آپ کی عقل کا حال معلوم ہو چکا۔ (۲) نقل مطابق اصل۔

صرف ایصال ثواب وایصال گناہ کے مخمصوں سے چھٹی دلا دی، بلکہ اب جی بھر کے چوری کرو، ڈاکہ مارو، زنا کرو، جوا کھیلو، تاڑی اور شراب کو شیرِ مادر سمجھو۔ اگر تمہارے گناہ ہمالیہ کی بلندیوں سے بھی تجاوز کر جائیں تو اس کی فکر بھی کیا؟ وہ تو یہود و نصاریٰ پر ڈال دیئے جائیں گے۔ اور جس طرح ہمارے مفتی صاحب قبلہ مطمئن ہو بیٹھے ہیں کہ ہم مُردوں کے وکیل اور قائم مقام بن کر مُردوں کے ترکِ نماز وروزہ حج وزکوۃ وصدقات وخیرات سے نجات دلا دیں گے، اسی طرح امام مسلم، امام شافعی، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ہزار ہا مفتیان کرام، مفسرین، شراح، مولوی اور عالم یہ اطمینان فرما چکے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے گناہ یہود و نصاریٰ پر ڈال دیں گے۔" (ص:١١٨، ١٢٠)

کچھ اور ہرزہ سرائیاں: اور بھی کئی صحیح حدیثیں جن کا مطلب مؤلف نہیں سمجھ سکے ہیں، بھر بھر منہ ان کا استہزاء کرتے ہیں۔ پڑھئے اور عبرت حاصل کیجئے:

"مسلم شریف کی امور حسنہ اور اچھے طریقہ والی حدیث بے عملی کا شکار رہی، بالکل اسی طرح جیسے گرگٹ اور کتے، نیز سفر والی حدیث زنگ کھاتی رہ گئی، اگر میں نے ایصال ثواب، مردے کی قربانی اور حج بدل کو نہ چھیڑا ہوتا تو یہ زریں اوراق پڑے پڑے نذرِ دیمک ہو جاتے۔" (ص:١٢٥)

مگر ہم دعویٰ (٣) سے کہتے ہیں کہ نہ حضور نے کبھی کالا کتا مارا، اور نہ صحابہ کرام نے، اور نہ کسی محدث و مجتہد نے اس پر عمل کیا اور یہ حدیث بھی سرد خانے کی نذر ہو گئی۔ مفتی جمیل نذیری کو چاہئے کہ اس حدیث پر عمل کریں اور ایک کتا مار ٹیم بنا لیں۔ (ص:١٢٦)

یہ گرگٹ مارنے والی حدیث بھی آج تک بے عملی کی نذر رہی، اب مفتی صاحب محترم کو چاہئے کہ اپنی کتا مار ٹیم کے دوسرے حصے کو یہ شعبہ سپرد فرما کر گرگٹ مارنے کا ثواب لوٹیں، اور اس کا عشر، اس کی زکوۃ یا اس کی خیرات کے ثواب کو، والمؤمنین والمؤمنات اور والمسلمین والمسلمات کہہ کر مسلمانوں کو ایصال ثواب فرما دیں۔ (ص:١٢٦)

---

(١) دلیل سے کہئے جناب! دعویٰ بغیر دلیل، چھت بغیر دیوار ہے۔

> کیا اس حدیث پر کبھی عمل ہوا؟ عوام الناس کو تو چھوڑ یئے، آخر ان علمائے کرام، محدثین اور مفسرین کو کیا ہو گیا ہے کہ عطائی حکیموں اور ڈاکٹروں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں، معمولی زکام و بخار میں مختلف ڈاکٹروں اور طبیبوں سے نسخے لکھواتے رہتے ہیں۔ غالباً انھیں یہ حدیث حسن صحیح نہیں معلوم ہوئی، ورنہ اگر صحیح سمجھتے تو کم از کم مولویوں، مفتیوں کی جیب میں بجائے پان کی ڈبیہ کے، منگریلا کا تھیلا رہتا اور ہمہ وقت پھانکا کرتے۔“

مؤلف پر تو ہذیان مسلط ہے، حدیث میں بخار کا علاج ٹھنڈے پانی سے غسل آ گیا ہے، بس ان کو بخار چڑھ گیا، لگے محدثین و علماء کو منہ بھر بھر گالیاں دینے۔ کسی تکلیف کے باعث رسول اللہ ﷺ کے متعلق منقول ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا۔ بس لگیں قلم سے پھلجڑیاں چھوٹنے۔ لکھتے ہیں:

> ”اس حدیث کے بیان کرنے میں نہ راوی کو شرم آئی، اور نہ امام بخاری کا دل دھڑکا، اور نہ آپ کو اس کا حوالہ دینے میں حیا آئی۔ آپ کی غیرت کی ہانڈی تو چوراہے پر پھوٹ گئی، مگر آپ کو تو ایصال ثواب کو حق ثابت کرنا ہے، چاہے آپ کی بکواس سے حضور کا دامن داغ دار ہو جائے، یا پوری دنیا کے مسلمان شرم سے اپنا سر جھکا لیں۔ (ص:۱۴۴)
>
> حضور کو کھڑے کھڑے پیشاب کرا کے امت کا سر شرم سے جھکا دیا۔“ (ص:۱۴۷)

او ناسمجھ مؤلف! تم صرف راوی، امام بخاری، اور مفتی صاحب پر کیا الزام دھرتے ہو، صاف صاف ان تمام علماء و محدثین کو بھی صلواتیں کیوں نہیں سناتے، جنھوں نے یہ روایت بیان کی، پڑھی اور سنی؛ مگر کسی کا دل نہ دھڑکا۔ اور چودہ سو برس بعد مبارکپور کا ایک ہینڈلوم چلانے والا اپنے دل کی دھڑکنوں سے سرسام میں مبتلا ہو گیا۔

مؤلف کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حدیث، کتابوں میں اسلام کی ابتدائی صدی سے موجود ہے۔ لیکن بحمد اللہ اس کی وجہ سے نہ حضور ﷺ کا دامن داغ دار ہوا، نہ کسی مسلمان کا سر

شرم سے جھکا۔ آپ کی بدگوئیوں سے البتہ پوری ملت پر پانی پھر رہا ہے۔ کچھ سمجھا آپ نے؟ تکلیف اور عذر کے مسائل و معاملات بالکل الگ ہوتے ہیں، اس حالت میں اگر کوئی ایسا کام کیا جائے، جو عام حالات میں باعث شرم ہو تو اسے حیا کے خلاف آپ ہی جیسے عقل دشمنوں کا کام ہوسکتا ہے۔ مؤلف محترم! توہین وتذلیل سے بچو، ورنہ ہوسکتا ہے کہ خدا کی جانب سے کسی شدید پھٹکار میں گرفتار کردیئے جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل بحالتِ مجبوری ہے۔ آپ چلانے لگے کہ کیسا درد تھا کہ آپ بیٹھ نہیں سکتے تھے؟ کبھی آپ کی پیٹھ میں یا زانو میں چمک پڑی ہے یا نہیں؟ اگر نہ پڑی ہو تو کسی ایسے شخص سے پوچھ لو، جس نے یہ تکلیف بھگتی ہو، اندازہ ہوجائے گا۔

بے چارہ مؤلف جہاں علوم سے کورا ہے، وہیں طبیعت انسانی سے بھی بالکل نابلد ہے۔ یہ اعذار سب کو پیش آتے ہیں، مگر مولوی ملا لوگ صاحبِ شریعت نہیں ہیں کہ ان کی ہر ہر نقل وحرکت محفوظ رکھی جائے۔ یہ حضور ﷺ کا امتیاز ہے کہ آپ کا ہر عمل اسوہ ہے، تکلیف کی حالت میں آپ کا یہ عمل اسوہ بن گیا، اس سے پتلون والوں کو کہاں سے اجازت مل گئی؟ اپنی بات کی جھونک میں جو جی چاہے لکھ دیجئے، آپ کی آبرو رہنی چاہئے، چاہے باقی تمام دنیا کی آبرو اتر جائے۔ یہ محض آپ کا وہم ہے کہ اس روایت سے حضور ﷺ کا دامن داغ دار ہوگیا۔ یہی طرز فکر رہا تو احادیث وسنن کے ایک بڑے ذخیرے سے دست برداری کا اعلان کرنا پڑے گا۔ لیکن آپ کے لیے تو کچھ مشکل نہیں، آپ کی چڑیے جیسی عقل سلامت رہے۔

اصل صورت واقعہ: یہاں ہم ناظرین کا خلجان دور کرنے کے لیے اصل صورت واقعہ لکھے دیتے ہیں، اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ مؤلف کی چیخ وپکار کس درجہ بے عقلی پر مبنی ہے۔

بخاری کی روایت میں قدرے اجمال واختصار ہے، طبرانی میں حضرت عصمہ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک گھورے کے پاس پہنچے، امام حاکم اور بیہقی کی روایت - جو حضرت ابوہریرہ سے منقول ہے - کے مطابق آپ کے گھٹنے کے اندرونی حصے میں جو پاؤں موڑنے کی صورت میں پنڈلی اور ران کے اتصال کا موقع ہے، ایک زخم تھا، جس

کی وجہ سے آپ گھٹنے سے پاؤں کو موڑ نہیں سکتے تھے، اس مجبوری سے آپ نے حضرت حذیفہ کو آواز دی، چنانچہ طبرانی میں یہ لفظ منقول ہے کہ یَا حُذَیْفَةُ اُسْتُرْنِیْ. اے حذیفہ! ذرا آڑ کر لو۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا۔ یہ واقعہ کی تفصیل ہے۔(۱) ایک مجبوری کی حالت میں نہایت احتیاط اور تحفظ کے ساتھ آپ کا یہ عمل منقول ہے، اس میں کون سی بات قابلِ شرم ہے؟ لیکن مؤلف کو علم و تحقیق سے تو کوئی واسطہ ہے نہیں، اپنی زنگ کھائی ہوئی عقل سے جو چاہے منہ سے نکال دے، اسے تو نہ خوف خدا دامن گیر ہے اور نہ کسی کا پاس و لحاظ، اپنی ذہنی غلاظت کی تصویر ہر واقعہ میں دیکھ لیتا ہے اور اسے ظاہر کر دیتا ہے۔

دریدہ دھنی کی حد: ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اس قدر سخت پابندیوں کے باوجود آپ ہیں کہ میرے سر پر درجنوں مولوی ملا مفتیوں کی ''حمقیات'' کا گٹھر لاد رہے ہیں، جیسے میں مقروض ہوں۔'' (ص:۱۵۹)

ناظرین کرام! ان درجنوں مولوی ملا مفتیوں کی فہرست پڑھ لیجئے، اس فہرست میں چاروں ائمہ، بڑے بڑے ائمہ محدثین و فقہاء سب ہیں، ان حضرات کی باتیں حمقیات ہیں، اور تنِ تنہا ''عبدالخالق اعظمی'' کے فرمودات عقلیات ہیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

(۱)امام ابوحنیفہ (۲)امام مالک (۳)امام شافعی (۴)امام احمد بن حنبل (۵)عبداللہ بن مبارک (۶)اسحاق بن راہویہ (۷)سفیان ثوری (۸)امام اوزاعی (۹)حافظ ابن حجر عسقلانی (۱۰)امام نووی (۱۱)ملا علی قاری (۱۲) علامہ ابن تیمیہ (۱۳)علامہ ابن قیم (۱۴)امام بخاری (۱۵)امام مسلم (۱۶)امام ترمذی (۱۷)امام ابوداؤد (۱۸)امام نسائی (۱۹)امام ابن ماجہ۔ رحمہم اللہ اجمعین

☆☆☆☆☆

دیکھو: فتح الباری، باب البول عند صاحبه اور باب البول عند سباطة قوم ج:۱ص:۳۲۹

آخری بات

کتاب آپ نے پڑھ لی، آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ایک ایسا شخص جس نے دینی علوم کو باقاعدہ استاذ ومربی کے ماتحت رہ کر حاصل نہ کیا ہو، اس سے کتنی غلطیاں اور کوتاہیاں صادر ہوسکتی ہیں۔ یہ ایک عام قانونِ الٰہی ہے کہ علم وفن خواہ کوئی ہو، صرف کتاب پڑھ لینے سے نہیں آجاتا، اس کے لیے باقاعدہ ریاضت کرنی ہوتی ہے۔

ایک پڑھے لکھے شخص نے رسالہ ''خوانِ نعمت'' میں بریانی پکانے کی ترکیب دیکھ لی، اچھی طرح سمجھ لیا، اور دل میں مگن ہوا کہ اب باورچی کی کیا ضرورت؟ میں خود پکالیا کروں گا۔ ایک دن پکانے بیٹھا، اول تو آگ کا جلانا مشکل ہوگیا، دو چار جگہ خود جلا، پھر آگ جلی، ٹھیک ترکیب کے مطابق بریانی تیار کی، لیکن جب بریانی پک چکی تو کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکا کہ کھانے کی یہ کون سی قسم تیار ہوئی اور کھانے کی چیز ہے بھی یا نہیں؟ وہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ بریانی یہی ہے، میں نے ''خوانِ نعمت'' کی ترکیب کے مطابق پکائی ہے؛ مگر جن لوگوں نے بریانی کھائی ہے، وہ شدت سے انکار کرتے ہیں کہ خواہ یہ کچھ ہو، مگر بریانی نہیں ہے۔ کیا فرق پڑ گیا؟ فرق یہی ہے کہ ایک شخص نے محض کتاب دیکھ کر اپنی فہم سے بریانی پکانی سیکھی، اور دوسرا شخص گو اس درجہ ذہین اور قابل نہیں ہے، لیکن کسی جاننے والے اور پکانے والے سے اس نے سیکھا ہے، دونوں کا یہ فرق ہر شخص کیا عام کیا خاص سب تسلیم کرتے ہیں، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

ٹھیک یہی حال اس شخص کا بھی ہوتا ہے جس نے دین کو اور علم دین کو اساتذہ سے نہیں سیکھا، بلکہ بطورِ خود اسے حاصل کیا، یہ شخص جب کوئی بات دین کی ترجمانی کے عنوان

سے پیش کرتا ہے تو وہی بریانی کا حال ہوتا ہے کہ اس شخص کی دانست میں یہی دین ہے، لیکن جاننے والے بول پڑتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، مگر دین تو ہرگز نہیں ہے۔

لیکن یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ دین کا خود رو ترجمان اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے سب سے پہلے انھیں لوگوں کی تغلیط وتردید کرنا ضروری سمجھتا ہے، جنھوں نے باقاعدہ علوم دین کو حاصل کیا اور سیکھا ہے۔ تاریخ کے ہر ہر مرحلے پر ہمیں یہی تماشا نظر آتا ہے، اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کچھ لوگ اٹھے، انھوں نے صحابہ کرام ہی کو غلط کہنا شروع کر دیا، حالانکہ صحابہ کی جماعت نے دین کو براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا تھا، لیکن یہ نادان سمجھے کہ دین وہ ہے جو ہم کہتے ہیں۔ بالآخر خارجی اور رافضی کا لقب پا کر، امت سے کٹ گئے۔ پھر ایک گروہ اٹھا، اس نے بھی اپنی عقل کے زور سے دین کو سمجھنے کی کوشش کی اور محدثین وفقہاء کے خلاف جھنڈا اٹھالیا، وہ معتزلہ کے نام سے الگ ٹولی بنا کر دوسری راہ پر نکل گئے۔ تاریخ کا مطالعہ جنھوں نے کیا ہے، وہ اچھی طرح ان امور کو سمجھتے ہیں۔ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد یہاں بھی یہ تماشا بہت ہوا، کوئی صاحب اٹھتے ہیں اور عوام میں اشتہار تقسیم کرتے ہیں کہ ''مولوی کا مذہب غلط'' ہے، کوئی صاحب کسی گوشے سے سر اٹھاتے ہیں اور اعلان ہو جاتا ہے کہ ''اینٹی مولوی تحریک'' چلے گی، کوئی صاحب کھڑے ہوتے ہیں اور پکار کر لوگوں کو جمع کر کے مولوی کے خلاف اکساتے ہیں، مولوی کا وقار گراتے ہیں، سب کے پیچھے ایک بات ہے کہ اپنی قوت مطالعہ سے دین کا ایک خاکہ تجویز کر لیا اور طے کر لیا کہ یہی دین ہے۔ مگر انھیں معلوم تھا کہ جو لوگ دین کو اصل اور صحیح صورت میں پہچانتے ہیں، وہ کبھی قبول نہ کریں گے، اس لیے ان جیسے لوگوں نے اپنی تحریک کا ضروری اور بنیادی جزء یہ بھی رکھا کہ علماء ومحدثین اور اکابر سلف کی ''ذہنی غلامی'' سے لوگوں کو آزاد کرا دیا جائے؛ تاکہ ہماری بات کی قبولیت کا میدان ہموار ہو، لیکن ان لوگوں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ:

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ

سَبِیُلِ الْمُؤْمِنِیُنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصُلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَاءَ تُ مَصِیُراً.

اور جو رسول کا خلاف کرے، بعد اس کے کہ ہدایت کی راہ اس پر کھل چکی، اور مسلمانوں کی راہ سے الگ راہ چلے، ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے، اور کیا ہی بری جگہ ہے پلٹنے کی۔

مسلمانوں کی جو راہ قرنِ اول سے بن چکی ہے، اس سے الگ راہ نکالنے والا اپنا انجام سوچ لے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ آخرت میں جو ہونا ہے وہ تو ہے ہی، دنیا میں بھی ”غیر سبیل المؤمنین“ والوں کو امت کا اجتماعی مزاج کبھی قبول نہیں کرتا۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ لوگ سب سے کٹ کر ایک فرقہ کی صورت میں رہ جاتے ہیں، اور عموماً تو فنا ہو جاتے ہیں۔

ہم نے آپ کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا ہے، اس میں مؤلف کی تصویر دیکھ لیجئے، اور صرف مؤلف ہی کی نہیں، جتنے ”غیر سبیل المؤمنین“ والے ہیں، سب کی اصل شکل وصورت اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس قسم کے لوگوں کا تفصیلی جائزہ تو مستقل ایک کتاب کا متقاضی ہے، یہاں ہم مزید اتنا اور عرض کریں گے کہ اہل حق میں بھی فروعی اختلافات ہیں، ان اختلافات کو بھی یہ لوگ ایک ڈراؤنی شکل میں پیش کرتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا اعتماد اہل حق سے اٹھ جائے۔ بے چارے مؤلف نے بھی یہ حربہ چلایا ہے۔ ذرا تیور ملاحظہ ہو:

> ”ان اختلافات کو پڑھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ اگر امام ابوحنیفہ مشرق کی طرف جا رہے ہیں، تو امام مالک مغرب کی سمت، اگر امام احمد بن حنبل شمال کی طرف رواں ہیں تو امام شافعی جنوب کی جانب سرگرداں۔ اگر امام ابن تیمیہ وابن قیم سوئے فلک پرواز کر رہے ہیں تو معتزلہ اور متکلمین تحت الثریٰ میں روپوشی کے کوشاں ہیں۔ اور مذکورہ مسالک کے بزرگ خالی ہاتھ نہیں جا رہے ہیں، بلکہ ان کے ساتھ احادیث کا ایک بڑا انبار بھی ہے، بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، مؤطا شریف، ابوداؤد شریف، ابن ماجہ شریف، نسائی شریف، بیہقی شریف، دارقطنی، دارمی، مسند

عبد بن حمید، مصنف عبد الرزاق، مسند بزار، مسند ابویعلی، مستدرک حاکم، مسند ابن حنبل اور مشکوۃ شریف کی احادیث کے اسلحوں سے لیس سرگرم سفر ہیں۔" (ص:۳۴)

بے چارے نے بلاغت کا سارا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حضرات جب خود اتنے مختلف اور متضاد سمتوں میں جا رہے ہیں تو کون ان کا ساتھ دے! لہٰذا سب کو چھوڑو، اور ہمارے پیچھے آؤ۔ کتنا بھولا پن ہے! کہ اور لوگ چونکہ مختلف سمتوں میں گئے ہیں، اس لیے غلط، اور ہماری راہ صحیح۔ رہی دلیل تو اس کو مت پوچھو۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا ☆ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ناظرین کرام! اہل حق کے اختلافات کی جو تصویر مؤلف نے بتائی ہے، وہ غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے اختلافات کو یوں سمجھو، جیسے ایک تناور درخت ہو کہ جڑ تو ایک ہے، لیکن اس میں شاخیں بہت ہیں، اور ہر شاخ کا رخ الگ الگ جانب ہے، تاہم شاخوں کا یہ اختلاف، درخت کے لیے عیب نہیں ہنر ہے۔

یوں ہی سمجھو کہ دین حق کی بنیاد تو ایک ہے، اہل حق کے اختلافات اسی بنیاد سے نکلی ہوئی الگ الگ شاخیں ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اختلافات برے ہیں؟ ان اختلافات کے سلسلے میں مکمل وضاحت مولانا مناظر احسن گیلانی کی بے نظیر تالیف "تدوین حدیث" میں پڑھئے۔

البتہ مؤلف اور ان جیسے لوگوں کا اختلاف شاخ کا اختلاف نہیں ہوتا، ان کی جڑ ہی دوسری ہوتی ہے۔ اہل اسلام کو اس طرح کے لوگوں سے بہت اجتناب کرنا چاہئے۔

مرادِ ما نصیحت بود، کردیم۔

اعجاز احمد اعظمی
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ء

☆☆☆☆☆